فہرست

شذرات	سود	جاوید احمد غامدی	۲
	''ربا'' سے متعلق سپریم کورٹ کے سوالات	معز امجد	۷
قرآنیات	البقرہ (۲: ۲۰۴-۲۱۴)	جاوید احمد غامدی	۱۹
معارفِ نبوی	ذریت آدم۔ دو کتابیں	طالب محسن	۲۵
دین و دانش	قانون معاشرت (۱۰)	جاوید احمد غامدی	۳۵
حالات و وقائع	قومی تعمیر میں مذہبی قیادت کا کردار (۲)	منظور الحسن	۴۷
اصلاح و دعوت	متفرق مضامین	محمد اسلم نجمی، طالب محسن، ساجد حمید، وسیم اختر مفتی	۶۳
ادبیات	غزل	جاوید احمد غامدی	۶۹

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

[سپریم کورٹ کے سود کی ممانعت کے فیصلے پر نظر ثانی کی اپیل شریعت اپلیٹ بنچ کے زیر سماعت ہے۔ اس موقع پر سود کی تعریف اور اس کے اطلاقات ایک مرتبہ پھر زیر بحث آ گئے ہیں۔ اپنے قارئین کی دلچسپی کے پیش نظر یہاں دو تحریریں شائع کی جا رہی ہیں۔ ایک مدیر ''اشراق'' جناب جاوید احمد غامدی کی کتاب ''میزان'' میں ''سود'' کی بحث ہے اور دوسری ان کے شاگرد جناب معز امجد کی طرف سے سپریم کورٹ کے ایک سوال نامے کا جواب ہے۔ یہ سوال و جواب انگریزی میں تھے۔ محمد بلال صاحب نے انھیں اردو زبان میں منتقل کیا ہے۔ ادارہ]

سود

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سود ایک اخلاقی نجاست ہے جس میں ملوث افراد اور ادارے اپنے اصل سرمایے کو بالکل بے داغ محفوظ رکھ کر اور کوئی جوکھم برداشت کیے بغیر منافع بٹانے کے لیے اپنے مقروض کے سر پر سوار رہتے ہیں۔ عربی زبان میں اس کے لیے 'ربٰوا' کا لفظ مستعمل ہے۔ قرآن نے اس کے لیے یہی لفظ استعمال کیا ہے۔ عربی زبان سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ اس سے مراد وہ معین اضافہ ہے جو قرض دینے والا اپنے مقروض سے محض اس بنا پر وصول کرتا ہے کہ اس نے ایک خاص مدت کے لیے اس کو روپے کے استعمال کی اجازت دی ہے۔ قرآنِ مجید نے اسے پوری شدت کے ساتھ ممنوع قرار دیا ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں فرمایا ہے:

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ، ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ، وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا۔ فَمَنْ جَآءَہٗ مَوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّہٖ فَانْتَھٰی فَلَہٗ

''جو لوگ سود کھاتے ہیں، وہ قیامت کے دن اٹھیں گے تو بالکل اس شخص کی طرح اٹھیں گے جس کو شیطان نے اپنی چھوت سے پاگل بنا دیا ہو۔ یہ اس وجہ سے ہو گا کہ انھوں نے کہا: بیع بھی تو آخر سود ہی کی طرح ہے اور تعجب ہے کہ اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام ٹھیرایا

مَا سَلَفَ ، وَاَمْرُهٗٓ اِلَی اللّٰہِ ، وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ۔ (۲:۲۷۵)

ہے۔ چنانچہ جس کو اس کے پروردگار کی یہ تنبیہ پہنچی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ وہ لے چکا، سو لے چکا اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، اور جو اب اس کا اعادہ کریں گے تو وہی اہلِ دوزخ ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

اسی سورہ میں آگے فرمایا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا ، اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ، وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَکُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِکُمْ ، لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ۔ (۲:۲۷۸۔۲۷۹)

''ایمان والو، اگر تم سچے مومن ہو تو اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود باقی رہ گیا ہے، اسے چھوڑ دو۔ پھر اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کے لیے خبردار ہو جاؤ۔ اور اگر تم توبہ کر لو تو اصل رقم کا تمھیں حق ہے، نہ تم ظلم کرو گے اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ان آیات میں سود خواروں کے قیامت میں پاگلوں کی طرح اٹھنے کی وجہ قرآن نے یہ بتائی ہے کہ وہ اس بات پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ اللہ نے بیع وشرا کو حلال اور سود کو حرام ٹھیرا دیا ہے، دراں حالیکہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جب ایک تاجر اپنے سرمایے پر نفع لے سکتا ہے تو ایک سرمایہ دار اگر اپنے سرمایے پر نفع کا مطالبہ کرے تو وہ آخر مجرم کس طرح قرار پاتا ہے؟ قرآن کے نزدیک یہ ایسی پاگل پن کی بات ہے کہ اس کے کہنے والوں کو جزا اور عمل میں مشابہت کے قانون کے تحت قیامت میں پاگلوں اور دیوانوں ہی کی طرح اٹھنا چاہیے۔

استاذ امام امین احسن اصلاحی سود خواروں کے اس اظہارِ تعجب پر تبصرہ کرتے ہوئے ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس اعتراض سے یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آ گئی کہ سود کو بیع پر قیاس کرنے والے پاگلوں کی نسل دنیا میں نئی نہیں ہے، بلکہ بڑی پرانی ہے۔ قرآن نے اس قیاس کو ... لائقِ توجہ نہیں قرار دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بداہتہً باطل اور قیاس کرنے والے کی دماغی خرابی کی دلیل ہے۔ ایک تاجر اپنا سرمایہ ایک ایسے مال کی تجارت پر لگاتا ہے جس کی لوگوں کو طلب ہوتی ہے۔ وہ محنت، زحمت اور خطرات مول لے کر اس مال کو ان لوگوں کے لیے قابلِ حصول بناتا ہے جو اپنی ذاتی کوشش سے اول تو آسانی سے اس کو حاصل نہیں کر سکتے تھے اور اگر حاصل کر سکتے تھے تو اس سے کہیں زیادہ قیمت پر جس قیمت پر تاجر نے ان کے لیے مہیا کر دیا۔ پھر تاجر اپنے سرمایہ اور مال کو کھلے بازار میں مقابلہ کے لیے پیش کرتا ہے اور اس کے لیے منافع کی شرح بازار کا اتار چڑھاؤ مقرر کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس اتار چڑھاؤ کے ہاتھوں بالکل دیوالیہ ہو کر رہ جائے اور ہو سکتا ہے

کہ کچھ نفع حاصل کر لے۔ اسی طرح اس معاملے میں بھی اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں کہ وہ ایک بار ایک روپے کی چیز ایک روپے دو آنے یا چار آنے میں بیچ کر پھر اس روپے سے ایک دھیلے کا بھی کوئی نفع اس وقت تک نہیں کما سکتا، جب تک اس کا وہ روپیہ تمام خطرات اور سارے اتار چڑھاؤ سے گزر کر پھر میدان میں نہ اترے اور معاشرے کی خدمت کر کے اپنے لیے استحقاق نہ پیدا کرے۔

بھلا بتائیے کیا نسبت ہے ایک تاجر کے اس جاں باز، غیور اور خدمت گزار سرمایہ سے ایک سود خوار کے اس سنگ دل، بزدل، بے غیرت اور دشمن انسانیت سرمایہ کو جو جوکھم تو ایک بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں، لیکن منافع بٹانے کے لیے سر پر سوار ہو جاتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۱/۶۳۲۔۶۳۳)

سود کی یہی شناعت ہے جس کی بنا پر، بیان کیا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الربٰوا سبعون حوباً ایسرها ان ینکح الرجل امه ۔ (ابن ماجہ، رقم ۲۳۰۴)

''سود اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کے اگر ستر حصے کیے جائیں تو سب سے ہلکا حصہ اس کے برابر ہو گا کہ آدمی اپنی ماں سے بدکاری کرے۔''

قرآنِ مجید نے اگرچہ سود لینے ہی کو حرام ٹھیرایا ہے، لیکن اس حرمت کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ بغیر کسی عذر کے اس کے کھانے اور کھلانے والے، لکھنے والے اور اس کے گواہوں کو بھی تعاون علی الاثم کے اصول پر یکساں مجرم قرار دیا جائے۔ چنانچہ جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

لعن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم اکل الربٰوا ومؤکله و کاتبه وشاهدیه و قال: هم سواء ۔ (مسلم، رقم ۱۵۹۸)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے اور کھلانے والے اور اس کی دستاویز لکھنے والے اور اس دستاویز کے دونوں گواہوں پر لعنت کی اور فرمایا: یہ سب برابر ہیں۔''

اسی طرح مبادلۂ اشیا کی صورت میں ادھار کے معاملات میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ہر آلایش سے بچنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

الذهب بالذهب وزناً بوزن، مثلاً بمثل والفضة بالفضةوزناً بوزن، مثلاً بمثل، فمن زاد و استزاد فهو رباً ۔ (مسلم، رقم ۱۵۸۸)

''تم سونا ادھار بیچو تو اس کے بدلے میں وہی سونا لو، اسی وزن اور اسی قسم میں اور چاندی ادھار بیچو تو اس کے بدلے میں وہی چاندی لو، اسی وزن اور اسی قسم میں، اس لیے کہ جس نے زیادہ دیا اور زیادہ چاہا تو یہی سود ہے۔''

الورق بالذهب رباً الاهاء وهاء والبر

''سونے کے بدلے میں چاندی ادھار بیچو گے تو اس

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بالبر ربا الاھاء وھاء والشعیر بالشعیر ربا الاھاء وھاء والتمر بالتمر ربا الاھاء وھاء۔ (مسلم، رقم۱۵۸۶)

میں سود آ جائے گا[۱]۔ گندم کے بدلے میں دوسری قسم کی گندم،[۲] جو کے بدلے میں دوسری قسم کے جو اور کھجور کے بدلے میں دوسری قسم کی کھجور میں بھی یہی صورت ہو گی۔ ہاں، البتہ یہ معاملہ نقداً نقد ہو تو کوئی حرج نہیں۔‘‘

ان روایتوں کا صحیح مفہوم وہی ہے جو ہم نے اوپر اپنے ترجمہ میں واضح کر دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا وہ یہی تھا۔ روایتیں اگر اسی صورت میں رہتیں تو لوگ ان کا یہ مدعا سمجھنے میں غلطی نہ کرتے، لیکن بعض دوسرے طریقوں میں راویوں کے سوءِ فہم نے ان میں سے دوسری روایت سے ’ھاء وھاء‘ کا مفہوم پہلی روایت میں، اور پہلی روایت سے ’الذھب بالذھب‘ کے الفاظ دوسری روایت میں ’الورق بالذھب‘ کی جگہ داخل کر کے انھیں اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ ان کا حکم اب لوگوں کے لیے ایک لاینحل معما ہے۔ ہماری فقہ میں ’ربا الفضل‘ کا مسئلہ اسی غتربود کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے، ورنہ حقیقت وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں واضح کر دی ہے کہ ’انما الربٰوا فی النسیئۃ‘[۳] (سود صرف ادھار ہی کے معاملات میں ہوتا ہے)۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ سود کا تعلق صرف انھی چیزوں سے ہے جن کا استعمال ان کی اپنی حیثیت میں انھیں فنا کر دیتا اور اس طرح مقروض کو انھیں دوبارہ پیدا کر کے ان کے مالک کو لوٹانے کی مشقت میں مبتلا کرتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس پر اگر کسی اضافے کا مطالبہ کیا جائے تو یہ عقل و نقل، دونوں کی رو سے ظلم ہے، لیکن اس کے برخلاف وہ چیزیں جن کے وجود کو قائم رکھ کر ان سے استفادہ کیا جاتا ہے اور استعمال کے بعد وہ جس حالت میں بھی ہوں، اپنی اصل حیثیت ہی میں ان کے مالک کو لوٹا دی جاتی ہیں، ان کے استعمال کا معاوضہ کرایہ ہے اور اس پر، ظاہر ہے کہ کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ قرض کسی غریب اور نادار کو دیا گیا ہے یا کسی کاروباری یا رفاہی اسکیم کے لیے، اس چیز کو ربا کی حقیقت کے تعین میں کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ بات بالکل مسلم ہے کہ عربی زبان میں ربا کا اطلاق قرض دینے والے کے مقصد اور مقروض کی نوعیت و حیثیت سے قطعِ نظر محض اس معین اضافے ہی پر ہوتا ہے جو کسی قرض کی رقم پر لیا جائے۔

۱؂ یہ سد ذریعہ کی نوعیت کا حکم ہے۔ آپ نے اس اندیشے سے کہ معاملہ چونکہ ادھار کا ہے اور صنف کے اختلاف کی وجہ سے اس میں کمی بیشی تو بہرحال ہو گی، لوگوں کو اس سے منع فرمایا ہے۔

۲؂ اس جملے کا عطف چونکہ ’الورق بالذھب‘ پر ہوا ہے جس میں صنف کا اختلاف بالکل واضح ہے، اس وجہ سے عربیت کی رو سے ’البر بالبر‘ میں پہلے ’البر‘ کے معنی، ظاہر ہے کہ دوسری قسم کی گندم ہی کے ہو سکتے ہیں۔

۳؂ مسلم، رقم۱۵۹۶۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

چنانچہ یہ بات خود قرآنِ مجید نے واضح کر دی ہے کہ اس کے زمانۂ نزول میں سودی قرض زیادہ تر کاروباری لوگوں کے مال میں جا کر بڑھنے ہی کے لیے دیے جاتے تھے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰہِ، وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَکٰوۃٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُضْعِفُوْنَ۔ (الروم ۳۰:۳۹)

''اور جو سودی قرض تم اس لیے دیتے ہو کہ دوسروں کے مال میں پروان چڑھے تو وہ اللہ کے ہاں پروان نہیں چڑھتا، اور جو زکوٰۃ تم نے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دی تو اسی کے دینے والے ہیں جو اللہ کے ہاں اپنا مال بڑھاتے ہیں۔''

اس میں دیکھ لیجیے 'لیربوا فی اموال الناس' (اس لیے کہ وہ دوسروں کے اموال میں پروان چڑھے) کے الفاظ نہ صرف یہ کہ غریبوں کو دیے جانے والے صرفی قرضوں کے لیے کسی طرح موزوں نہیں ہیں، بلکہ صاف بتاتے ہیں کہ اس زمانے میں سودی قرض بالعموم تجارتی مقاصد ہی کے لیے دیا جاتا تھا اور اس طرح قرآنِ مجید کی تعبیر کے مطابق گویا دوسروں کے مال میں پروان چڑھتا تھا۔ یہی بات سورۂ بقرہ کی اس آیت سے بھی واضح ہوتی ہے:

وَاِنْ کَانَ ذُوْعُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ، وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ، اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (۲:۲۸۰)

''اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو ہاتھ کھلنے تک اسے مہلت دو، اور اگر تم بخش دو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم سمجھتے ہو۔''

استاذ امام امین احسن اصلاحی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں بعض کم سواد یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عرب میں زمانۂ نزولِ قرآن سے پہلے جو سود رائج تھا، یہ صرف مہاجنی سود تھا۔ غریب اور نادار لوگ اپنی ناگزیر ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے کے لیے مہاجنوں سے قرض لینے پر مجبور ہوتے تھے اور یہ مہاجن ان مظلوموں سے بھاری بھاری سود وصول کرتے تھے۔ اسی سود کو قرآن نے ربا قرار دیا ہے اور اسی کو یہاں حرام ٹھیرایا ہے۔ رہے یہ تجارتی کاروباری قرضے جن کا اس زمانے میں رواج ہے تو ان کا نہ اس زمانے میں دستور تھا، نہ ان کی حرمت و کراہت سے قرآن نے کوئی بحث کی ہے۔

ان لوگوں کا نہایت واضح جواب خود اس آیت کے اندر ہی موجود ہے۔ جب قرآن یہ حکم دیتا ہے کہ اگر قرض دار تنگ دست (ذو عسرۃ) ہو تو اس کو کشادگی (میسرۃ) حاصل ہونے تک مہلت دو تو اس آیت نے گویا پکار کر یہ خبر دے دی کہ اس زمانے میں قرض لینے والے امیر اور مال دار لوگ بھی ہوتے تھے۔ بلکہ یہاں اگر اسلوبِ بیان کا صحیح صحیح حق ادا کیجیے تو یہ بات نکلتی ہے کہ قرض کے لین دین کی معاملت زیادہ تر مال داروں ہی میں ہوتی تھی، البتہ امکان اس کا بھی تھا کہ کوئی قرض دار تنگ حالی میں مبتلا ہو کہ اس کے لیے مہاجن کی اصل رقم کی واپسی بھی ناممکن ہو رہی ہو تو اس کے متعلق یہ ہدایت ہوئی کہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مہاجن اس کو اس کی مالی حالت سنبھلنے تک مہلت دے اور اگر اصل بھی معاف کر دے تو یہ بہتر ہے۔ اس معنی کا اشارہ آیت کے الفاظ سے نکلتا ہے، اس لیے کہ فرمایا ہے کہ: 'ان کان ذو عسرة فنظرة الی میسرة' (اگر قرض دار تنگ حال ہو تو اس کو کشادگی حاصل ہونے تک مہلت دی جائے)۔ عربی زبان میں 'ان' کا استعمال عام اور عادی حالات کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ بالعموم نادر اور شاذ حالات کے بیان کے لیے ہوتا ہے۔ عام حالات کے بیان کے لیے عربی میں 'اذا' ہے۔ اس روشنی میں غور کیجیے تو آیت کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اس زمانے میں عام طور پر قرض دار 'ذو میسرة' (خوش حال) ہوتے تھے، لیکن گاہ گاہ ایسی صورت بھی پیدا ہو جاتی تھی کہ قرض دار غریب ہو یا قرض لینے کے بعد غریب ہو گیا ہو تو اس کے ساتھ اس رعایت کی ہدایت فرمائی۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۶۳۸۔۶۳۹)

اس کے بعد انھوں نے اپنی اس بحث کا نتیجہ اس طرح بیان کیا ہے:

''ظاہر ہے کہ مال دار لوگ اپنی ناگزیر ضروریاتِ زندگی کے لیے مہاجنوں کی طرف رجوع نہیں کرتے رہے ہوں گے، بلکہ وہ اپنے تجارتی مقاصد ہی کے لیے قرض لیتے رہے ہوں گے۔ پھر ان کے قرض اور اس زمانے کے ان قرضوں میں جو تجارتی اور کاروباری مقاصد سے لیے جاتے ہیں، کیا فرق ہوا؟'' (تدبرِ قرآن ۱/ ۶۳۹)

——— جاوید احمد غامدی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

''ربا'' سے متعلق سپریم کورٹ کے سوالات

پہلا سوال

قرآنِ مجید نے ''ربا'' کی ممانعت فرمائی ہے۔ اس اصطلاح کا کیا مطلب ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں آپ اس کی کیا تعریف اور تعبیر کریں گے؟

جواب

لفظ ''ربا'' کا مفہوم متعین کرنے کے معاملے میں یہ نکتہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ قرآنِ مجید نے لفظ ''ربا'' اصطلاحی نہیں، بلکہ سادہ لغوی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اگر یہ لفظ قرآن میں بطور اصطلاح کے استعمال کیا گیا ہوتا تو یہ ضروری تھا کہ اس کا مفہوم متعین کرنے کے لیے قرآن مجید ہی کو بنیاد بنایا جاتا۔ چونکہ یہ لفظ اپنے سادہ لغوی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے، اس لیے اس کا مفہوم متعین کرنے کے لیے قرآنِ مجید ہی پر انحصار ضروری نہیں رہا ہے۔ لہٰذا ہم اس کے لیے وہی طریق کار اختیار

کریں گے جو کسی بھی زبان کے کسی بھی لفظ کا مفہوم متعین کرنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔

فاضل عدالت کا تقاضا یہ ہے کہ ''ربا'' کی تعریف اور تعبیر قرآن وسنت کی روشنی میں بیان کی جائے۔ یہ تقاضا اسی صورت میں پورا کیا جا سکتا تھا اگر ''ربا'' کا لفظ قرآن میں لغوی کے بجائے اصطلاحی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہوتا یا قرآن وحدیث میں عربی الفاظ کے معنی بیان کرنے والے الگ ابواب بھی قائم کیے گئے ہوتے۔ قرآن نے یہ لفظ اپنے لغوی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اس لیے میں اپنی تحقیقات کی بنیاد مستند لغات اور عربی زبان کے دوسرے ماخذوں ہی پر رکھوں گا۔

عربی فعل ''ربا، یربو'' کا اکثر عربی لغات میں حسب ذیل لغوی مفہوم بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ زاد و نما : بڑھنا۔ نشوونما پانا

اسم 'ربا' یا 'الربا' جو قرآن میں عام طور پر استعمال ہوا ہے اس کے معنی سب سے مستند اور معروف عربی لغت ''اقرب الموارد'' میں 'العینة ...... و الفضل' بیان کیے گئے ہیں:

یعنی لفظ 'ربا' یا 'الربا' بطور اسم حسب ذیل دو مفاہیم کا حامل ہے:

''اقرب الموارد'' لفظ 'عین' کے تحت 'بیع العینة' کے حسب ذیل معنی بیان کرتا ہے:

''ایک شخص دوسرے شخص سے قرض مانگتا ہے، اب چونکہ قرض کی رقم سے کچھ زائد رقم وصول کرنا ممنوع ہے اس لیے قرض دینے والا قرض دینے میں دلچسپی نہیں رکھتا، لہٰذا وہ قرض مانگنے والے سے کہتا ہے کہ میں تمھیں یہ کپڑا بارہ درہم میں ادھار ایک خاص مدت کے لیے دیتا ہوں۔ جبکہ اس کپڑے کی اصل قیمت دس درہم تھی۔ پھر قرض خواہ قرض دار سے دو درہم زائد اس مخصوص مدت کے لیے وصول کرتا ہے۔ (یہ دو درہم ''ربا'' ہی ہیں)۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یہاں اس بات کی وضاحت بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ لفظ ''ربا'' اور ''الربا'' کے مطلب اور تعبیر میں وقت کے ساتھ کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ اس لفظ کا مطلب جدید عربی لغات میں حسب ذیل بیان کیا جاتا ہے:

''الرائد'' کے مطابق:

''۱۔ زائد (مثلاً زائد رقم) یا اضافہ۔

۲۔ قرض کے اوپر کوئی وصولی''

''لاروس'' کے مطابق:

''زائد (مثلاً زائد رقم)، وصولی یا منافع جو قرض دینے والا قرض پر وصول کرتا ہے۔ (معاشیات کی اصطلاح میں) وہ رقم جو قرض کی رقم لینے والا قرض کے علاوہ کچھ مخصوص شرائط (مثلاً مدت اور شرح کے تعین) پر ادا کرتا ہے۔''

اسی نوعیت کا مطلب ''المعجم الوسیط'' میں بیان کیا گیا ہے۔

اوپر درج ''ربا'' کے مطالب کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ (''اقرب الموارد''، ''لاروس'' اور ''المعجم الوسیط'' میں بتائے گئے مفہوم کی بنیاد پر) لفظ ''ربا'' کے معنی یہ ہیں:

۱۔ کوئی اضافہ۔

۲۔ قرض پر مدت اور شرح کے پیشگی تعین کی شرائط کے ساتھ لیا جانے والا اضافہ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن میں ''ربا'' کا لفظ ان دونوں مفاہیم میں سے کس مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ ''ربا'' سے متعلق آیات کا دقت نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بڑے قطعی انداز سے کہی جا سکتی ہے کہ اوپر مذکور دونوں مطالب میں سے قرآن کے پیش نظر دوسرا مطلب ہے۔ ہماری اس ترجیح کے حسب ذیل وجوہ ہیں:

۱۔ اگر قرآن نے یہ لفظ محض ''اضافہ'' کے مفہوم میں استعمال کیا ہوتا تو ''اضافہ'' کا ہر قسم کے کاروبار پر بھی اطلاق ہوتا۔ لیکن قرآن کے الفاظ سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ قرآن کی ان آیات میں لفظ ''ربا'' میں اس قسم کے ''اضافہ'' کا مفہوم نہیں پایا جاتا۔ قرآن کہتا ہے:

قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ (البقرہ ۲: ۲۷۵)

''وہ کہتے ہیں: تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے کہا: اللہ نے تجارت کو حلال قرار دیا اور ربا سے منع کیا ہے۔''

ان جملوں سے صاف واضح ہے کہ کسی کاروبار سے حاصل ہونے والا ''اضافہ'' (نفع) ''ربا'' نہیں ہے۔

۲۔ مزید دیکھیے۔ سورۂ بقرہ میں ہے:

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَکُمْ رُءُ وْسُ اَمْوَالِکُمْ لَاتَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔ (۲: ۲۷۹)

''اور اگر تم توبہ کر لو تو اصل رقم کا تمھیں حق ہے۔ نہ تم کسی کا حق مارو، نہ تمھارا حق مارا جائے۔''

اس آیت نے یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ یہاں ''ربا'' سے مراد خاص وہ اضافہ ہے جس کا مطالبہ قرض دینے والا مقروض سے کرتا ہے۔

۳۔ اس کے بعد غور کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاِنْ کَانَ ذُوْعُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (البقرہ ۲: ۲۸۰)

''اور اگر (مقروض) تنگ دست ہو تو فراخی تک اس کو مہلت دو اور بخش دو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔''

اس تفصیل سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ قرآن نے ''ربا'' کا لفظ اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے جس مفہوم

میں انگریزی زبان میں قرض کے اوپر انٹرسٹ (Interest) اور اردو زبان میں سود کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

دوسرا سوال

''ربا'' کے اطلاق کا دائرہ کیا ہے؟ کیا ''ربا'' کی اصطلاح کا اطلاق بنکوں اور دوسرے مالیاتی اداروں سے انٹرسٹ پر حاصل کیے گئے تجارتی اور پیداواری قرضوں پر بھی ہوتا ہے؟

جواب

پہلے سوال کے جواب سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ لفظ ''ربا'' کے اطلاق میں اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ وہ ''ربا'' پر لیا گیا قرض ذاتی (غیر کاروباری) مقاصد کے لیے ہے یا کاروباری مقاصد کے لیے۔ قرآن کی رو سے ''ربا'' ممنوع ہے خواہ وہ ذاتی استعمال کے قرض پر لیا جائے یا کاروباری استعمال کے قرض پر۔

اگر کوئی شخص اس نقطۂ نظر کا حامل ہے کہ ''ربا'' سے متعلق قرآنی آیات ذاتی قرض سے متعلق ہیں تو اس صورت میں یہ بات ثابت کرنے کی ذمہ داری محض اس شخص پر ہوگی جو شخص یہ بات کہتا ہے اور اس ضمن میں وہی دلیل قابل قبول ہوگی جس میں کلاسیکی عربی زبان سے یہ ثابت کیا جائے گا کہ ''ربا'' کا لفظ صرف ذاتی (غیر کاروباری) قرضوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یا یہ ثابت ہو جائے کہ قرآن میں جہاں یہ حکم بیان ہوا ہے، اس کا سیاق وسباق اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ''ربا'' کے مفہوم میں کاروباری قرض بھی شامل کیا جائے۔ اگر کوئی ایسی دلیل یا کوئی ایسا قرینہ نہیں ہے تو پھر ''ربا'' کو غیر کاروباری قرض کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

یہ بات سورۂ روم کی ایک آیت سے مزید مستحکم ہو جاتی ہے کہ نزول قرآن کے وقت لوگ تجارتی قرض پر سود دیا کرتے تھے۔ آیت ملاحظہ فرمایئے:

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاْ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَاللّٰهِ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ۔ (۳۰:۳۹)

''اور جو سودی قرض تم اس لیے دیتے ہو کہ وہ دوسرے کے مال کے اندر پروان چڑھے تو اللہ کے ہاں پروان نہیں چڑھتا اور جو تم زکوٰۃ دو گے اللہ کی رضا جوئی کے لیے یہی لوگ ہیں جو اللہ کے ہاں اپنے مال کو بڑھانے والے ہیں۔''

اس آیت کے ان الفاظ ''اور جو سودی قرض تم اس لیے دیتے ہو کہ وہ دوسروں کے مال کے اندر پروان چڑھے'' سے واضح ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت ذاتی قرضوں کے علاوہ تجارتی قرضے بھی دیے جا رہے تھے۔ لہٰذا اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ''ربا'' کی ممانعت کے دائرے میں غیر کاروباری اور کاروباری ہر قسم کا قرض آتا ہے۔ اور اس طرح قرآن کی متعلقہ آیات

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کا اطلاق بنکوں اور دوسرے مالیاتی اداروں سے حاصل کیے گئے ان تمام قرضوں پر ہوتا ہے جن پر سود وصول کیا جاتا ہے۔

تیسرا سوال

پاکستانی بنک اور کچھ دوسرے مالیاتی ادارے مارک اپ (Markup) کے اوپر بائی بیک (Buy Back) کی بنیاد پر اپنے کلائنٹ کی سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ اس طریق کار میں بنک کے کلائنٹ کا منشا ہوتا ہے کہ وہ کوئی مخصوص جنس تجارت بنک کو فروخت کرے اور اسی طرح زیادہ قیمت پر اقساط میں ادائیگی کی بنیاد پر اسے دوبارہ خریدے۔ مارک اپ کی ایک خاص (مثلاً سالانہ) شرح کا مذکورہ دوسری فروخت پر اطلاق ہوتا ہے۔ کیا یہ معاملہ ''ربا'' کے تحت آتا ہے؟

جواب

جیسا کہ میں نے پہلے سوال کے جواب میں عرض کیا اس قسم کا معاملہ ''بیع العینة'' یا ''العینة'' کہلاتا ہے۔ یہ معاملہ بھی اس سود پر حاصل کیے گئے قرض سے مشابہ ہے جو ''اقرب الموارد'' میں ''ربا'' کی اصل تعریف کے ضمن میں بیان کیا گیا۔ یہ معاملہ بھی حسب ذیل دو خصوصیات کے جمع ہو جانے کے باعث ''ربا'' ہی کے تحت آتا ہے:

۱۔ ادھار فروخت پر ایسا منافع لینا جو نقد پر فروخت کے منافع کے علاوہ ہے۔

۲۔ مارک اپ (Markup) کی ایک خاص (مثلاً سالانہ) شرح کا مذکورہ دوسری فروخت پر اطلاق ہونا۔

ان دونوں خصوصیات کے جمع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرض (ادھار فروخت) پر پیشگی ایک شرط (مارک اپ کی ایک شرح) طے کی گئی ہے، جس کا قرض دینے والا قرض لینے والے سے اس بات پر تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس مالی اثاثے کو ایک خاص وقت (مثلاً ایک سال) تک استعمال کرے۔ میرے پہلے سوال کے جواب کے مطابق یہ معاملہ سرتاسر ''ربا'' کے تحت آتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

چوتھا سوال

کیا ''ربا'' کی ممانعت کے حوالے سے مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق ہے؟ کیا ''ربا'' کی ممانعت کے دائرے میں وہ قرضے بھی آتے ہیں جو غیر مسلموں سے حاصل کیے جاتے ہیں یا ان مسلم ممالک سے لیے جاتے ہیں جن کے قوانین اور پالیسیاں بین الاقوامی مالی قوانین اور پالیسیوں کے مطابق ہیں اور جن پر پاکستان کی ریاست کا کنٹرول نہیں ہے؟

جواب

قرآنِ مجید سے یہ بات بالکل قطعی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی ریاست کسی شخص کو خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم ''ربا'' لینے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس معاملے میں ایک اسلامی ریاست میں مسلمان اور غیر مسلم شہری میں بالکل کوئی فرق روا نہیں رکھا جا سکتا۔

یہاں یہ بات بھی بہت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ ریاست پاکستان یا کوئی اور مسلم ریاست جب افراد کے حوالے سے ''ربا'' پر پابندی لگائے گی تو اس میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق روا نہیں رکھا جائے گا۔ اسی طرح وہ تمام ادارے خواہ مسلمانوں کے ہوں یا غیر مسلموں کے اگر ریاست کے دائرۂ اختیار (Jurisdiction) میں آتے ہیں، ان میں بھی اس ضمن میں کوئی تفریق نہیں کی جائے گی۔

یہاں ایک اور نکتہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن درحقیقت ''ربا'' لینے سے منع کرتا ہے، ''ربا'' دینے کی ممانعت احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آئی ہے جو درحقیقت ''ربا'' لینے ہی کی ممانعت کا ایک نتیجہ ہے۔ یعنی ''ربا'' لینے ہی کی ممانعت حقیقی اور بنیادی ممانعت کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ ایک باریک نکتہ ہے، اس لیے ہم اس کی مزید تفصیل کرتے ہیں۔

جیسا کہ قرآنی آیات سے یہ واضح ہے اصل ممانعت ''ربا'' لینے سے متعلق ہے۔ قرآن کی ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جو ''ربا'' دینے سے منع کرتی ہو۔ اس کی وجہ سادہ ہے۔ قرآن کے نزدیک اصل اخلاقی خرابی، ناانصافی اور زیادتی ''ربا'' لینے ہی میں پائی جاتی ہے نہ کہ ''ربا'' دینے میں۔ قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر قیادت ریاست مدینہ کا اصل زور ''ربا'' لینے کے خاتمے پر ہے نہ کہ ''ربا'' دینے کے خاتمے پر۔ اس سارے عرصے کے دوران میں قرآن ''ربا'' لینے والوں کو اس سزا سے ڈراتا ہے جو انھیں قیامت کے دن بھگتنا پڑے گی۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی ریاست کے حکمران کی حیثیت سے ''ربا'' لینے والوں کو الٹی میٹم دیا کہ اگر وہ اپنی روش سے باز نہ آئے تو ان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جائے گا۔ (البقرہ ۲:۲۷۹)

اس دوران میں ایک آیت بھی ایسی نازل نہیں ہوئی جس نے لوگوں کو ''ربا'' دینے سے روکا ہو اور نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ''ربا'' دینے سے منع فرمایا۔ اس کے برعکس قرآن ''ربا'' دینے والے کو مقروض کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنے کی تلقین کرتا، اس سے اصل رقم لینے کے سلسلے میں مناسب مہلت دینے کی ہدایت کرتا، بلکہ بعض حالات میں اپنی رقم لینے ہی سے دست کش ہو جانے کی نصیحت کرتا ہے۔ اور یہ ترغیب دیتا ہے کہ اگر وہ رقم مقروض کو انفاق کر دے تو اس کا صلہ وہ روز آخرت میں پائے گا۔

اس کے بعد جب دورِ نبوی کی ریاست مدینہ میں ''ربا'' لینا مکمل طور پر ختم ہو گیا اور کسی ایک شخص کو بھی ''ربا'' لینے کی اجازت نہ رہی، معاشرہ اس برائی سے پاک ہو گیا اور ''ربا'' لینا ایک قابل سزا جرم قرار پا گیا، تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا کہ وہ لوگ جو ''ربا'' پر قرض دیتے ہیں یا جو خاموشی سے ''ربا'' دینے کی حامی بھرتے ہیں یا جو ''ربا'' کی دستاویز لکھتے ہیں یا جو اس دستاویز پر گواہ بنتے ہیں اور یہ معاملہ ریاست کے نوٹس میں نہیں لاتے تو انھوں نے ریاستی احکام کی خلاف ورزی کی ہے جس کی بنا پر یہ سب ملعون اور سزا کے مستحق ہیں۔

قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے یہ واضح ہوا کہ اصل جرم ''ربا'' لینا ہے، جبکہ ''ربا'' دینا اس وقت جرم بنتا ہے جب معاشرہ ''ربا'' سے بالکل پاک ہو چکا ہو اور ''ربا'' دینا ریاست کی سطح پر ممنوع اور قابل سزا جرم قرار دیا جا چکا ہو۔

اب ہم وہ اقدامات بیان کرتے ہیں جو ''ربا'' کے خاتمے کے لیے ریاست کو ابتدا میں کرنے چاہییں:

۱۔ اپنی ریاستی حدود میں تمام شہریوں اور اداروں کو کسی شخص سے، خواہ وہ ملک میں رہتا ہو یا دوسرے ملک میں مقیم ہو، ہر مالی معاملے میں ''ربا'' لینے سے منع کیا جائے۔

۲۔ اپنی ریاستی حدود میں تمام شہریوں اور اداروں کو کسی ادارے سے، خواہ وہ ادارہ ملکی ہو یا غیر ملکی اور خواہ وہ ادارہ ملکی حدود کے اندر کام کرتا ہو یا ان سے باہر، ہر قسم کے مالی معاملے میں ''ربا'' لینے سے منع کیا جائے۔

۳۔ کسی شخص سے، خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی کسی مالی معاملے میں حکومت ''ربا'' لینے سے باز رہے۔

۴۔ کسی ادارے سے، خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی اور خواہ وہ ملکی حدود میں کام کرتا ہو یا ان حدود سے باہر، ہر قسم کے مالی معاملے میں حکومت ''ربا'' لینے سے باز رہے۔

۵۔ کسی دوسرے ملک سے کسی قرض یا امداد پر ''ربا'' لینے سے اجتناب کیا جائے۔

۶۔ ریاست کے اندر رہنے والے اور ریاستی حدود میں کام کرنے والے ایسے ادارے جو ان پابندیوں کی خلاف ورزی کریں، ان کے خلاف قوانین بنائے جائیں اور انھیں سزا دی جائے۔

۷۔ ان شہریوں اور اداروں کے خلاف قوانین بنائے جائیں اور انھیں مجرم سمجھ کر سزا دی جائے جو ملکی حدود میں کسی مالی معاملے میں کسی دوسرے شہری اور ادارے کو ''ربا'' دینے پر راضی ہو جاتے ہیں اور یہ بات ریاست کے نوٹس میں نہیں لاتے۔

۸۔ ایسے ملکی شہریوں اور اداروں کو مجرم سمجھ کر ان کے خلاف قوانین بنائے جائیں اور ان پر سزا نافذ کی جائے جو کسی ''ربا'' پر مبنی دستاویز کو تحریر کرتے یا اس پر گواہ بنتے اور ایسے معاملے کو ریاست کے نوٹس میں نہیں لاتے۔

اس ضمن میں ''ربا'' کی ممانعت پر مبنی بنائے گئے قوانین پاکستان سے باہر کے ان لوگوں اور اداروں پر لاگو نہیں ہوں گے جو ''ربا'' پر قرض دیتے ہیں۔ اسی طرح، ملکی حدود کے باہر رہنے والے لوگوں یا ان سے باہر کام کرنے والے اداروں سے حاصل کیے گئے قرض پر ''ربا'' کی ادائیگی ''ممانعت ربا'' کے قوانین کے دائرے میں نہیں آئے گی۔ حکومت پاکستان کو البتہ واضح طور پر ہدایت کی جانی چاہیے کہ وہ اس بات کی حتی الوسع کوشش کرے کہ جب قرض لے تو وہ ''ربا'' کی شرط کے ساتھ نہ ہو، لیکن مشہور ہے کہ ''بھکاری انتخاب کا حق نہیں رکھتے''۔ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ''ربا'' کی ادائیگی کے بغیر معاملہ نہ ہو پا رہا ہو تو ظاہر ہے کہ پھر معاہدوں کی پابندی کرتے ہوئے ''ربا'' کی ادائیگی کی جائے گی۔ مگر اس سے ''ممانعت ربا'' کے قانون کی ان شقوں پر کوئی فرق نہیں پڑے گا جن کا اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پانچواں سوال

حکومت پاکستان اور حکومت کے تحت کچھ دوسرے ادارے بانڈز اور سرٹیفکیٹ وغیرہ جاری کر کے قرض حاصل کرتے ہیں۔ پھر یہ سرٹیفکیٹس اور بانڈز رکھنے والوں کو مقررہ منافع دیتے ہیں۔ کیا یہ منافع بھی ''ربا'' کے زمرے میں آتا ہے؟

جواب

حکومت پاکستان اور حکومت کے تحت دوسرے ادارے سرٹیفکیٹس اور بانڈز کے اجرا سے جو رقم بطور قرض حاصل کرتے ہیں، اس پر دیا جانے والا ''منافع''، چونکہ پیشگی طور پر متعین شدہ شرح پر دیا جاتا ہے، اس وجہ سے یہ ''منافع'' دراصل ''ربا'' ہی کے زمرے میں آتا ہے۔

چھٹا سوال

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ کاغذی کرنسی کی قدر (Value) افراط زر کے باعث کم ہو جاتی ہے۔ جب قرض دینے والے کو ایک خاص مدت کے بعد اس کی رقم لوٹائی جاتی ہے تو اس وقت اس افراط زر کے باعث اسے نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس صورت میں قرض دینے والا اس نقصان کی تلافی کے لیے قرض لینے والے سے کچھ زائد رقم کا تقاضا کرے تو کیا یہ تقاضا بھی ''ربا'' ہی شمار ہوگا؟

جواب

اگر افراطِ زر کی صحیح شرح کے مطابق قرض کی اصل رقم سے کچھ زائد رقم کا تقاضا کیا جائے تو وہ ''ربا'' شمار نہیں ہوگا۔ اس صورت میں نہ قرض دینے والا قرض کے استعمال پر پہلے سے متعین شدہ زائد رقم کا تقاضا کرسکتا ہے اور نہ اس زائد رقم کو حقیقی طور پر نفع کہا جاسکتا ہے۔

افراطِ زر یا روپے کی حقیقی قدر میں کمی بیشی کے لحاظ سے قرضوں کی ایڈجسٹمنٹ کے لیے عدل وقسط پر مبنی کوئی طریقہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر:

۱۔ یہ معاملہ حکومت پاکستان کی طرف سے اعلان کی گئی افراطِ زر کی شرح کے مطابق کیا جائے۔

۲۔ یہ معاملہ ملک میں سب سے زیادہ صرف ہونے والی چند چیزوں کی اوسط قیمت کے مطابق کیا جائے۔

۳۔ یہ معاملہ ملک میں سونے کی قیمت میں جو اتار چڑھاؤ آتا ہے، اس کے مطابق کیا جائے۔ مثال کے طور پر قرض کے لین دین کے موقع پر دونوں فریقین اس وقت مارکیٹ میں سونے کی قیمت کے لحاظ سے معاہدے میں یہ شرط رکھ لیتے ہیں کہ قرض کی واپسی کے وقت مارکیٹ میں سونے کی جو قیمت ہوگی، اس کے مطابق ادائیگی کی جائے گی۔ فرض کریں، اسلم خاور کو ۱۰۰ روپے قرض دیتا ہے اور اس وقت مارکیٹ میں سونے کی قیمت ۱۰۰ روپے فی گرام ہے تو اس وقت یہ طے پائے گا کہ خاور

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نے اسلم سے ۱۰۰ گرام سونا قرض لیا ہے۔ پھر جب خاور قرض اتارتا ہے اور اس وقت سونے کی قیمت ۱۵۰ روپے فی گرام ہے تو اسے ۱۵۰ روپے واپس کرنا ہوں گے۔ اسی طرح اگر قرض لوٹاتے وقت سونے کی قیمت ۹۰ روپے فی گرام ہو تو خاور اسلم کو ۹۰ روپے واپس کرے گا۔

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ ہمارے نزدیک قرض کے لین دین میں افراط زر کے مطابق ایڈجسٹمنٹ نہ صرف جائز، بلکہ مطلوب ہے، جس طرح ایک قرض دینے والا ''ربا'' وصول کر کے قرض لینے والے پر ظلم کرتا ہے، اسی طرح قرض لینے والا قرض اتارتے وقت افراطِ زر کی حقیقت نظر انداز کر کے قرض دینے والے پر ظلم کرتا ہے۔

ساتواں سوال

اگر انٹرسٹ اور مارک اپ کی تمام صورتیں اسلامی احکام سے متصادم ہیں تو سرمایہ کاری کے حسب ذیل معاملات کے لیے آپ کیا تجویز کرتے ہیں؟

۱۔ تجارتی سرمایہ کاری۔ ۲۔ صنعت کاری۔ ۳۔ بجٹ کا خسارہ پورا کرنے کے لیے سرمایہ کاری۔ ۴۔ غیر ملکی قرض کا حصول۔ ۵۔ اور اسی طرح کی دوسری ضرورتیں اور مقاصد۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جواب

اس نوعیت کے مسائل حل کرنا علماے دین کا کام نہیں ہے۔ اس کے لیے مسلمان ماہرین معیشت کی جانب رجوع کرنا چاہیے۔ علماے دین سے دین و شریعت کے احکام ہی سے متعلق رہنمائی لینی چاہیے۔ علماے دین چونکہ معیشت کے ایسے علم سے صحیح طور پر واقف نہیں ہوتے، اس لیے وہ اس معاملے میں صحیح جواب نہیں دے پاتے۔ ایسے سوال تا حال جواب سے اس لیے محروم ہیں کہ علماے دین اس سطح کی معاشی پیچیدگیوں کا ادراک نہیں کر پاتے، لیکن وہ پھر بھی جواب دے دیتے ہیں جس سے مسئلہ جوں کا توں قائم رہتا ہے۔ لہٰذا اس ضمن میں ملک اور امت مسلمہ کے ماہرین معیشت سے تجاویز لی جائیں۔ اس کے بعد علماے دین سے یہ رہنمائی لی جائے کہ ان تجاویز میں قرآن و سنت کی رو سے کوئی قباحت تو نہیں پائی جاتی۔

اس ضمن میں یہ رہنما اصول ملحوظ رکھنا چاہیے کہ سرمایہ کاری کا ہر وہ نظام جس میں قرض پر پہلے سے طے شدہ زائد رقم کی شرح (مثلاً سالانہ شرح) مقرر کر لی جائے تو وہ ''ربا'' ہے جو اسلامی شریعت میں ممنوع ہے۔ سرمایہ کاری کا جو نظام اس چیز سے پاک ہے اسے ''ربا'' سے پاک قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں مجوزہ یا متبادل ہر نظام کے شرعاً جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ کر لینا چاہیے۔

آٹھواں سوال

اگر آپ اس نقطۂ نظر کے حامل ہیں کہ انٹرسٹ کی تمام صورتیں شرعاً ممنوع ہیں تو آپ اس کو ملکی معیشت سے ختم کرنے

کے لیے کیا طریق کار تجویز کرتے ہیں؟ اگر اس معاملے میں کوئی تدریجی طریقہ اپنایا جائے تو اس کے لیے کیا حکمتِ عملی اختیار کی جائے جو قرآن و سنت کے تقاضوں کو بھی مجروح نہ کرے؟

جواب

ساتویں سوال کی طرح یہ سوال بھی مسلمان ماہرینِ معیشت سے کرنا چاہیے۔ البتہ، مسلمان ماہرینِ معیشت اگر اس مسئلے کا کوئی تدریجی حل پیش کرتے ہیں تو پھر علماے دین سے یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا اسلام اس طریقے کی اجازت دیتا ہے یا نہیں؟

اس ضمن میں عرض ہے کہ معاشرتی برائیوں کے خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ تدریجی طریقہ ہی اختیار کیا جائے۔ کسی نظام یا برائی کی اصلاح میں تدریجی طریقے کو اختیار کرنا بے حد ضروری ہے۔ اس ضمن میں غلامی جیسی برائی کے خاتمے کی کوشش کو پیشِ نظر رکھیں۔ نزولِ قرآن کے وقت یہ برائی معاشرے میں موجود تھی۔ قرآن ہمیشہ اس برائی کا مخالف رہا، لیکن چونکہ یہ برائی بہت سنگین شکل اختیار کیے ہوئے تھی اور معاشرے میں اپنی جڑیں گہرائی میں پھیلا چکی تھی، اس لیے قرآن نے اس کی اصلاح کے لیے ۲۳ سال کے عرصے میں پھیلے ہوئے ایسے اقدام کیے جن سے اس برائی کے خاتمے کی راہ ہموار ہوئی۔

اسی طرح، ماہرین کے نزدیک معیشت کو ''ربا'' سے پاک کرنے کے لیے اگر تدریجی طریقہ اختیار کرنا ضروری ہے تو پھر اسی طریقے کو اختیار کرنا ہو گا۔ معیشت کو ''ربا'' سے پاک کرنے کے لیے اٹھنے والا پہلا قدم خواہ اس کے لیے جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے صحیح سمت میں اٹھنے والا ہو گا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نواں سوال

اگر تمام مالی معاملات خلافِ شرع ہیں تو اس ضمن میں ماضی میں کیے گئے معاملات اور معاہدات کا کیا کیا جائے گا؟ خاص طور پر حکومت پچھلے غیر ملکی قرضوں کے معاملے میں کیا طریق کار اختیار کرے؟

جواب

اس معاملے میں بغیر کسی استثنا کے تمام غیر ملکی قرض دینے والوں کے ساتھ کیے گئے معاہدات کی پاس داری کی جائے اور معاہدات میں ''ربا'' دینے سے متعلق فریقین کے مابین جو شرائط طے ہوئی تھیں انھیں پورا کیا جائے گا، الا یہ کہ باہمی رضا مندی سے معاہدے میں کوئی ترمیم کر لی جائے۔

''ربا'' کے خاتمے پر مبنی قانون سازی کرنے کے بعد حکومت پاکستان ''ربا'' لینے سے ہر حال میں گریز کرے گی۔ البتہ اسے غیر ملکی قرض خواہوں کو معاہدات کے مطابق ''ربا'' ادا کرنا ہو گا۔ مستقبل کے حوالے سے عدالت عظمیٰ کو حکومت پاکستان کو یہ ہدایت کرنی چاہیے کہ وہ ان امور سے متعلق اپنی اخلاقی ذمہ داری محسوس کرے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اور جس

حد تک ممکن ہو آیندہ طے پانے والے معاہدات کو ''ربا'' سے پاک رکھے۔

جہاں تک اندرونِ ملک قرضوں کا معاملہ ہے تو ''ربا'' کی ممانعت پر مبنی قانون سازی کے بعد ایک ریاست ''ربا'' کی ادائیگی فوری طور پر روک سکتی ہے۔ مگر ایسا کرنے کے لیے ضروری ہو گا کہ حکومت عوام سے لیے گئے قرضے بھی فوری طور پر واپس کرنے کی پوزیشن میں ہو۔ لیکن یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ حکومت کی موجودہ مالی پوزیشن میں یہ ممکن نہیں ہے۔ اس صورتِ حال میں خاص طور پر جبکہ لوگوں کی ایک ناقابلِ تعین تعداد کی معیشت کا انحصار حکومت کی طرف سے جاری کردہ سرٹیفکیٹس اور بانڈز ہی کی آمدنی پر ہے، حکومت پر یہ لازم ہے کہ وہ ان لوگوں کے لیے جو ''ربا'' سے بچنا چاہتے ہیں، ''ربا'' سے پاک متبادل مہیا کرے۔ جب تک حکومت ان تقاضوں کو پورا کرنے کی پوزیشن حاصل نہیں کر پاتی اس وقت تک اسے چاہیے کہ وہ شہریوں کو ''ربا'' لینے کے جرم کی کراہت سے قرآن وسنت کی روشنی میں متنبہ کرے اور ''ربا'' لینے کے معاملے میں ان کی اخلاقی لحاظ سے حوصلہ شکنی کرے۔

دسواں سوال

کیا قرض دینے والا قرض سے متعلق منافع حاصل کرنے کا وقت اور اس کی شرح مقرر کر سکتا ہے، جبکہ مقروض یہ کہہ رہا ہو کہ وہ مطلوبہ روپیہ کمانے اور بر وقت رقم لوٹانے کے قابل ان شاء اللہ ہو جائے گا۔ اور اگر اس کے بعد مقروض رقم کی ادائیگی میں تاخیر کرے تو گارنٹی دینے والا منافع بونس یا تلافی کے لیے زائد رقم دے سکتا ہے۔ اگر اس صورتِ حال میں انشورنس کا نظام متعارف کرایا جائے تو دین اس پر کوئی اعتراض کرتا ہے؟

جواب

قرض پر پیشگی ''منافع کی شرح'' مقرر کرنا واضح طور پر ''ربا'' ہے۔ جو شخص ایسے ''منافع'' کے لیے ضامن بنتا ہے، وہ دراصل ''ربا'' کی ادائیگی کا ضامن بنتا ہے۔ اس صورت میں منافع کی انشورنس کرنے والے کی بھی وہی پوزیشن ہو گی جو ''ربا'' کی ادائیگی کے ضامن کی ہو گی۔

''ربا'' کا ضامن بننا دراصل شریعت کے ٹھیرائے ہوئے ایک منکر کا ضامن بننا ہے۔ ان معاملات میں جو شخص یا ادارہ ''ربا'' حاصل کر رہا ہے وہ شریعت کی نظر میں ایک بڑے جرم کا ارتکاب کر رہا ہے۔

______ معز امجد / محمد بلال

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(۴۲)

(گزشتہ سے پیوستہ)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ، وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ

(یہ عبادت ہے جس کی راہ روکنے والوں سے تم کو لڑنا ہے) اور (اِدھر صورت حال یہ ہے کہ تمھارے) لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں کہ جن کی باتیں تو اِس دنیا کی زندگی میں تمھیں بھلی معلوم ہوتی ہیں،[۵۵۳] اور وہ اپنے دل کے ارادوں پر اللہ کو گواہ بھی بناتے ہیں،[۵۵۴] لیکن ہیں وہ بدترین دشمن۔[۵۵۵] (تمھارے سامنے وہ یہی کرتے ہیں) اور جب وہاں سے ہٹتے ہیں تو اُن کی ساری تگ و دو اِس لیے ہوتی ہے کہ زمین میں فساد پھیلائیں اور کھیتیوں

[۵۵۳] یہ اشارہ ہے مدینہ کے ان منافقین کی طرف جو اللہ کی راہ میں جہاد و قتال کی باتیں کرتے تو زمین و آسمان کے قلابے ملاتے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ہٹتے تو ان کی ساری تگ و دو اللہ اور رسول سے لوگوں کو برگشتہ کرنے اور اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے ہوتی تھی۔ فرمایا کہ یہ سب اس دنیا کی زندگی ہی میں ہے۔ قیامت کے دن پردہ اٹھے گا تو اپنے باطن کو چھپانے کے لیے یہ کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔

[۵۵۴] منافق کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو معتبر ثابت کرنے کے لیے وہ بات بات پر قسم کھاتا ہے۔ اس لیے کہ اپنی نفسیاتی کمزوری کی وجہ سے وہ سمجھتا ہے کہ لوگ اس کی بات کو باور نہیں کریں گے۔

[۵۵۵] اصل میں 'الد الخصام' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں 'خصام' ہمارے نزدیک 'خصم' کی جمع ہے۔ یعنی

فِيۡهَا، وَ يُهۡلِكَ الۡحَرۡثَ وَ النَّسۡلَ، وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الۡفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَاِذَا قِيۡلَ
لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ، اَخَذَتۡهُ الۡعِزَّةُ بِالۡاِثۡمِ، فَحَسۡبُهٗ جَهَنَّمُ، وَلَبِئۡسَ الۡمِهَادُ۔ ﴿۲۰۶﴾
وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِیۡ نَفۡسَهُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ رَءُوۡفٌ
بِالۡعِبَادِ۔ ﴿۲۰۷﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا، ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ كَآفَّةً، وَّلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ

کو غارت کریں اور نسلیں تباہ و برباد کریں[556]، اور (تم جانتے ہو کہ) اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو تو گناہ پر آمادگی کے ساتھ اُن کا غرور دامن گیر ہو جاتا ہے[557]۔ سو اُن کے لیے جہنم کافی ہے۔ اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے[558]۔ ۲۰۴-۲۰۶

اور اِنھی لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں کہ اللہ کی رضا جوئی کے لیے اپنی جان کھپا دینے کے لیے تیار ہیں۔ (یہی ہیں کہ جن سے کوئی غلطی ہو جائے تو اللہ اُسے معاف کر دیتے ہیں)، اور اِس طرح کے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہیں۔ ۲۰۷

ایمان والو[559]، (ایمان کے ساتھ یہ دو رویے نہیں ہو سکتے، اِس لیے) تم سب[560] (ایک ہی طریقے سے) اللہ

دشمنوں میں سے بدترین۔

[۵۵۶] یعنی خدا کی جو دینونت اس سرزمین میں برپا ہے، اس میں لوگوں کو ایمان کی دعوت دینے اور اس طرح صلح و امن پر آمادہ کرنے کے بجائے وہ جنگ کی آگ بھڑکانا چاہتے ہیں جس کا نتیجہ، ظاہر ہے کہ حرث و نسل کی تباہی کی صورت ہی میں نکلے گا۔

[۵۵۷] اصل الفاظ ہیں: 'اخذتہ العزۃ بالاثم'۔ ان میں 'بالاثم' کی 'ب'، ہمارے نزدیک مصاحبت کے لیے ہے اور لفظ 'العزۃ' ٹھیک اس معنی میں آیا ہے جس میں یہ سورہ ص (۳۸) کی آیت ۲ 'بل الذین کفروا فی عزۃ و شقاق' میں ہے۔

[۵۵۸] مطلب یہ ہے کہ انھیں اگر اس وقت ڈھیل ملی ہوئی ہے تو یہ کوئی رعایت نہیں ہے۔ اس طرح کے لوگوں کے لیے دوزخ تیار ہے، وہ کوئی کمی نہ چھوڑے گی۔ ان کی شرارتوں کی جو سزا انھیں ملنی چاہیے، اس کے لیے بالکل کافی ہو جائے گی۔

[۵۵۹] یہ خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن روے سخن، اگر غور کیجیے تو انھی منافقین کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ انھیں

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

الشَّیۡطٰنِ، اِنَّہٗ لَکُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنۡ زَلَلۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡکُمُ الۡبَیِّنٰتُ، فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ۔ ﴿۲۰۹﴾

کی اطاعت میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔ اِن کھلی ہوئی تنبیہات کے بعد بھی جو تمھارے پاس آئی ہیں[561]، اگر تم لغزش کھاتے ہو تو جان لو کہ اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے[562]۔ ۲۰۸-۲۰۹

دعوت دی گئی ہے کہ شیطان کے پیچھے چلنے کے بجائے ان سچے اہل ایمان کی پیروی کرو جو اپنے پروردگار کی رضا کے لیے اپنا سب کچھ دینے کے لیے تیار ہیں۔

[۵۶۰] اصل میں لفظ 'کافۃ' استعمال ہوا ہے اور یہ یہاں ضمیر فاعل سے حال پڑا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم سب مسلمان ایک جماعت ہو تو اللہ کی اطاعت کے معاملے میں بھی تمھیں ایک ہی جماعت ہونا چاہیے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تم ایمان کا دعویٰ تو کرو اور پھر تم میں سے کچھ اللہ کا حکم ماننے والے ہوں اور کچھ شیطان کے پیچھے چلنے والے۔ اللہ کو ماننے کے بعد یہ رویہ کسی حال میں بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔

[۵۶۱] اصل میں لفظ 'بینات' آیا ہے۔ یعنی وہ آیات جو شیطان کے فتنوں سے خبردار کرنے اور ایمان و اسلام کے تقاضوں سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے قرآن میں وارد ہوئی ہیں۔ تنبیہات کے لفظ سے اس کا ترجمہ ہم نے اسی مفہوم کے لحاظ سے کیا ہے۔

[۵۶۲] اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا حوالہ یہاں جس پہلو سے آیا ہے، استاذ امام امین احسن اصلاحی اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> ''عزیز کی صفت کے حوالہ سے دو حقیقتوں کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ ایک تو اس حقیقت کی طرف کہ خدا کوئی کمزور و ناتواں ہستی نہیں ہے، بلکہ وہ غالب و توانا ہے تو جو اس کی تنبیہات کے باوجود شیطان کی پیروی کریں گے، ان کو وہ اس عذاب میں ضرور پکڑے گا جو شیطان کے پیرووں کے لیے اس نے مقدر کر رکھا ہے اور جس کی اس نے پہلے سے خبر دے رکھی ہے۔ دوسرا اس طرف کہ جو لوگ ان واضح ہدایات کے بعد بھی راہ حق کو چھوڑ کر شیطان ہی کی پیروی اختیار کریں گے، وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑیں گے، بلکہ اپنا ہی بگاڑیں گے۔ اس لیے کہ خدا عزیز ہے، یعنی ہر نفع و نقصان سے بالاتر۔
>
> اسی طرح حکیم کی صفت بھی یہاں دو حقیقتوں کو نمایاں کر رہی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس دنیا کا خالق حکیم ہے اور اس کے حکیم ہونے کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ وہ اپنی ہدایت پر جمے رہنے والوں اور اس سے منحرف ہو جانے والوں کے درمیان ان کے انجام کے لحاظ سے امتیاز کرے۔ اگر وہ ان میں کوئی امتیاز نہ کرے، بلکہ دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ دے یا دونوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ایک حکیم نہیں، بلکہ ایک کھلنڈرا ہے اور یہ دنیا ایک پرحکمت اور بامقصد کارخانہ

هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّآ اَنۡ يَّاۡتِيَهُمُ اللّٰهُ فِىۡ ظُلَلٍ مِّنَ الۡغَمَامِ وَالۡمَلٰٓئِكَةُ،وَقُضِىَ الۡاَمۡرُ، وَاِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۲۱۰﴾ سَلۡ بَنِىۡٓ اِسۡرَآءِيۡلَ كَمۡ اٰتَيۡنٰهُمۡ مِّنۡ اٰيَةٍ بَيِّنَةٍ، وَمَنۡ يُّبَدِّلۡ نِعۡمَةَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُ، فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ﴿۲۱۱﴾ زُيِّنَ لِلَّذِيۡنَ كَفَرُوا الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا، وَ يَسۡخَرُوۡنَ مِنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا، وَالَّذِيۡنَ

(اِس اتمام حجت کے باوجود) کیا یہ اِسی کے منتظر ہیں کہ اللہ اور اُس کے فرشتے بدلیوں کے سایے میں نمودار ہو جائیں اور معاملے کا فیصلہ کر دیا جائے؟ (لیکن یہ اللہ کا طریقہ نہیں ہے) اور اِس طرح کے معاملات تو اللہ ہی کے حوالے ہیں۔ بنی اسرائیل سے پوچھو، ہم نے اُن کو کتنی واضح نشانیاں دیں (، مگر اس سے کیا فائدہ ہوا؟)[۵۶۳] اور (حقیقت یہ ہے کہ) جو لوگ اللہ کی (ہدایت جیسی) نعمت کو پا لینے کے بعد (اُس کو گمراہی سے) بدلتے ہیں، (وہ اللہ کی گرفت سے نہیں بچ سکتے)۔ اِس لیے کہ اللہ سخت مواخذہ کرنے والا ہے۔ دنیا کی زندگی اِن منکروں کے لیے بڑی دل پسند بنا دی گئی ہے۔ (اِس کے انجام سے اِنھیں آگاہ کیا جائے تو نہیں سنتے) اور ایمان والوں کا مذاق اڑاتے ہیں[۵۶۴]، دراں حالیکہ خدا سے ڈرنے والے قیامت کے دن اِن کے مقابلے میں

نہیں، بلکہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشا ہے۔ دوسری یہ کہ بدی اور نیکی کے نتائج کے ظہور میں جو دیر سویر ہوتی ہے، وہ سب حکمت پر مبنی ہوتی ہے۔ بسا اوقات شیطان کے پیروکاروں کو اللہ تعالیٰ مہلت دیتا ہے اور بسا اوقات اہل حق کسی آزمایش میں ڈالے جاتے ہیں۔ اس سے نہ تو اہل باطل کو مغرور ہونا چاہیے نہ اہل حق کو مایوس، بلکہ یہ یقین رکھنا چاہیے کہ وہ مہلت اور یہ آزمایش، دونوں خدائے حکیم و دانا کی حکمت پر مبنی ہیں، اور اس حکمت کے تحت اس کے قوانین اور ان کے نتائج بالکل قطعی اور اٹل ہیں، ان میں سرمو فرق ممکن نہیں ہے۔'' (تدبر قرآن ۱/۴۹۹)

[۵۶۳] یہ منافقین چونکہ زیادہ تر بنی اسرائیل کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے فرمایا ہے کہ اپنے ان بھائیوں ہی سے پوچھ لو، وہ تمھیں بتائیں گے کہ جو لوگ عقل اور سمجھ سے کام نہیں لیتے، ان کی آنکھیں بڑے سے بڑا معجزہ دیکھ لینے کے بعد بھی بند ہی رہتی ہیں۔

[۵۶۴] یہ جس فریب نظر کی وجہ سے ہوتا ہے، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے:

''اس دنیا کی زندگی میں حق اور باطل اور کفر و ایمان، دونوں کو مہلت ملی ہوئی ہے۔ کوئی شخص اگر نیکی اور اطاعت کی راہ اختیار کرتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ وہ ابتلا کے قانون سے بالاتر ہو جائے، بلکہ بعض حالات میں اس کا ابتلا اس کے ایمان کے اعتبار سے سخت سے سخت تر ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کفر و نافرمانی کی زندگی گزارنا چاہتا ہے تو اس کے لیے بھی

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

اتَّقَوۡا فَوۡقَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ، وَاللّٰهُ يَرۡزُقُ مَنۡ يَّشَآءُ بِغَيۡرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾
كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً، فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيۡنَ وَ مُنۡذِرِيۡنَ، وَاَنۡزَلَ مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ فِيۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ، وَمَا اخۡتَلَفَ فِيۡهِ اِلَّا الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡهُ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنٰتُ بَغۡيًاۢ بَيۡنَهُمۡ، فَهَدَى اللّٰهُ

عالی مقام ہوں گے۔ (یہ اُن کے لیے اللہ کا فضل ہے) اور اللہ جس کو چاہے گا، اپنا فضل بے حساب عطا فرمائے گا۔[۵۶۵] ۲۱۰-۲۱۲

(اپنی منافقت کے لیے یہ اختلافات کو بہانہ بناتے ہیں۔[۵۶۶] اِنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) لوگ ایک ہی امت تھے۔ (اُن میں اختلاف پیدا ہوا) تو اللہ نے نبی بھیجے، بشارت دیتے اور انذار کرتے ہوئے اور اُن کے ساتھ قول فیصل کی صورت میں اپنی کتاب نازل کی تاکہ لوگوں کے درمیان وہ اُن کے اختلافات کا فیصلہ کر دے۔ یہ جن کو دی گئی، اِس میں اختلاف بھی اُنھی لوگوں نے کیا، نہایت واضح دلائل کے سامنے آ جانے کے بعد، محض آپس کے ضدم ضدا کی وجہ سے۔ پھر یہ جو (قرآن کے) ماننے والے ہیں، اللہ نے اپنی توفیق[۵۶۷] سے

سنت الٰہی یہ نہیں ہے کہ فوراً خدا کے فرشتے اتر کر اس کی گردن ناپ دیں، بلکہ اکثر حالات میں اس کو ایسی ڈھیل پر ڈھیل ملتی جاتی ہے کہ اس کی جسارت دن پر دن بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اسی فریب نظر کو یہاں 'زین' سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی اس دنیاوی زندگی کا یہ فریب اس طرح ان کی نگاہوں میں کھبا دیا گیا ہے کہ وہ اس کے اس پہلو سے نگاہ ہٹا کر کسی اور پہلو سے اس کو دیکھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے کہ ان کی نگاہوں میں اس زندگی کی اس خاص پہلو سے تزئین شیطان نے کی ہے، جیسا کہ قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں اس کی تصریح ہے۔ اور یہ امر بھی ظاہر ہے کہ شیطان کو اس تزئین کا موقع انسان کی عاجلہ پرستی اور اتباع شہوات نے فراہم کیا ہے۔'' (تدبر قرآن ۱/۵۰۱)

[۵۶۵] یعنی اس طرح عطا فرمائے گا کہ توقعات اور اندازوں کے تمام پیمانے اسے ناپنے سے قاصر رہ جائیں گے۔

[۵۶۶] یعنی کہتے ہیں کہ حق و باطل کا معاملہ کچھ ایسا واضح نہیں ہے کہ اس کے لیے ہم بالکل ہی یک سو ہو کر کھڑے ہو جائیں۔ اس میں اختلافات ہیں اور ان کا ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس معاملے میں کوئی حتمی بات کہنا کسی شخص کے لیے ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا جو کشمکش اس وقت برپا ہے، اس میں غیر جانب داری کا وہی رویہ صحیح ہے جو ہم نے اختیار کر رکھا ہے۔

[۵۶۷] اصل میں لفظ 'اذن' آیا ہے جس کے معنی اجازت کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اجازت امہال کے لیے بھی ہوتی ہے اور توفیق کے لیے بھی۔ یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ یہ توفیق کے لیے ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَا اخۡتَلَفُوۡا فِیۡهِ مِنَ الۡحَقِّ بِاِذۡنِهٖ، وَاللّٰهُ یَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۲۱۳﴾

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ، وَلَمَّا یَاۡتِکُمۡ مَّثَلُ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِکُمۡ، مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا حَتّٰی یَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰی نَصۡرُ اللّٰهِ، اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِیۡبٌ ﴿۲۱۴﴾

حق کے متعلق اِن سب اختلافات میں اِن کی رہ نمائی کی۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے، (اپنے قانون کے مطابق) سیدھی راہ کی ہدایت عطا فرماتا ہے۔[۵۶۸] ۲۱۳

(یہ سمجھتے ہیں کہ اِن پر کوئی ذمہ داری ڈالے بغیر ہی اِس راہ کی سب مشکلیں اللہ کی مدد سے دور ہو جانی چاہییں۔ خدا کے بندو)، تمھارا خیال ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، دراں حالیکہ تمھیں وہ حالات ابھی پیش ہی نہیں آئے جو (رسولوں کی بعثت کے نتیجے میں) تم سے پہلے لوگوں کو پیش آئے تھے؟ اُن پر آفتیں آئیں، مصیبتیں گزریں اور وہ ہلا مارے گئے، یہاں تک کہ رسول اور اُس کے ساتھ ایمان لانے والے سب پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ (اُس وقت بشارت دی گئی کہ) سنو، اللہ کی مدد قریب ہی ہے۔[۵۶۹] ۲۱۴

---

[۵۶۸] مطلب یہ ہے کہ حق تو ہمیشہ سے واضح رہا ہے اور اب بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے ذریعے سے اسے پوری طرح واضح کر دیا ہے، لیکن اس کو پانے کے لیے پہلی شرط یہی ہے کہ آدمی ضدم ضدا کا رویہ چھوڑ دے اور حق کا سچا طالب بن کر کتاب الٰہی کی طرف رجوع کرے۔ ہدایت وضلالت کے باب میں یہ اللہ کا قانون ہے اور اللہ اسی کے مطابق لوگوں کو سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

[۵۶۹] یعنی رسولوں کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی دینونت جب بھی کسی سرزمین میں برپا ہوئی ہے، اس کا طریقہ یہی رہا ہے کہ سزا بھی اتمام حجت کے بعد دی جاتی ہے اور سرفرازی کا فیصلہ بھی ایمان لانے والوں کے بعض غیر معمولی آزمایشوں سے گزرنے کے بعد ہی کیا جاتا ہے۔ اللہ کی مدد، جس طرح تم چاہتے ہو، اس طرح نہ اس سے پہلے کبھی آئی ہے اور نہ اب آئے گی۔ یہ سنت الٰہی ہے اور اللہ کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

طالب محسن

ذریت آدم

(مشکوۃ المصابیح حدیث:۹۶۔۹۷)

عن مسلم بن يسار قال : سئل عمر بن الخطاب [رضى اللّٰه عنه]عن هذه الآية: و إذ أخذ ربك من بنى آدم من ظهورهم ذريتهم ـ قال عمر : سمعت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه و سلم يسأل عنها ـ فقال: إن اللّٰه خلق آدم ـ ثم مسح ظهره بيمينه ـ فاستخرج منه ذرية ـ فقال : خلقت هؤلاء للجنة و بعمل اهل الجنة يعملون ـ ثم مسح ظهره ـ فاستخرج منه ذرية ـ فقال: خلقت هؤلاء للنار ـ وبعمل اهل النار يعملون ـ فقال رجل : ففيم العمل ، يارسول اللّٰه ؟ فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه و سلم : إن اللّٰه إذا خلق العبد للجنة ، استعمله بعمل أهل الجنة حتى يموت على عمل أهل الجنة ـ فيدخله به الجنة ـ وإذا خلق العبد للنار ، استعمله بعمل أهل النار ، حتى يموت على عمل من أعمال أهل النار ـ فيدخله به النار ـ

''مسلم بن یسار روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے آیت:'و إذ أخذ

ربك من بنی آدم من ظهورهم ذریتهم' کے بارے میں سوال کیا گیا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ (ایک مرتبہ) میں نے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی سوال کا جواب دیتے ہوئے سنا تھا۔ آپ نے بتایا تھا: اللہ تعالیٰ نے (حضرت) آدم (علیہ السلام) کو پیدا کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی کمر پر اپنا دایاں ہاتھ پھیرا۔اس طرح اس سے ایک نسل (یعنی اولاد آدم کی ایک جماعت) نکال لی۔ پھر کہا: ہم نے اسے جنت کے لیے پیدا کیا ہے۔اور یہ لوگ اہل جنت والے اعمال کریں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے (دوبارہ) کمر پر ہاتھ پھیرا۔اور ایک دوسری جماعت نکال لی۔ارشاد فرمایا: اسے میں نے جہنم کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ لوگ اہل جہنم والے اعمال کریں گے۔اس پر ایک آدمی نے پوچھا: یارسول اللہ، پھر عمل کس مقصد کے لیے ہو؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جب کسی آدمی کو جنت کے اعمال کے لیے پیدا کرتے ہیں تو اسے اہل جنت کے اعمال پر لگا دیتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اہل جنت والے اعمال کرتے ہوئے مرتا ہے اور ان اعمال کے نتیجے میں جنت میں داخل ہو جائے گا۔اور جب کسی آدمی کو جہنم کے لیے پیدا کرتے ہیں تو اسے اہل جہنم کے اعمال پر لگا دیتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اہل جہنم کے اعمال کرتے ہوئے مرتا ہے اور ان کے نتیجے میں جہنم میں داخل ہو جائے گا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

لغوی مباحث

ثم مسح ظهره بيمينه : ان الفاظ میں جو بات بیان ہوئی ہے، وہ تمثیل وتشبیہ کے پیرائے میں ہے۔اس کی حقیقت طے کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔

استعمله بعمل اهل الجنة : یعنی انھیں اہل جنت کے عمل کرنے کی توفیق دی جاتی ہے۔

متون

ذریت آدم سے لیے گئے عہد سے متعلق یہ روایت کتب حدیث میں کم وبیش انھی الفاظ میں نقل ہوئی ہے۔ کچھ راویوں نے روایت کے آخر میں' فيدخله به الجنة' والا جملہ'فيدخله ربه الجنة' یا'فيدخل الجنة' کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ دو تین سو سال کے بعد کی کتب میں اتنے معمولی فرق کی وجہ غالباً مؤطا امام مالک میں اس روایت کا ضبط تحریر میں آ جانا ہے۔ البتہ صحیح ابن حبان میں اس روایت کا ایک ملخص نقل ہوا ہے اور اس کے الفاظ کافی مختلف ہو گئے ہیں۔ روایت کے الفاظ

ہیں:

حدثنی عبدالرحمن بن قتادہ : سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم یقول: خلق اللّٰہ آدم ثم أخذ الخلق من ظھرہ فقال ھؤلاء فی الجنۃ و لاأبالی، فقال ھؤلاء فی النار و لا أبالی قال قائل یا رسول اللّٰہ فعلی ماذا نعمل ؟ قال علی مواقع القدر۔ (صحیح ابن حبان، رقم ۳۳۸)

''عبدالرحمٰن بن قتادہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا پھر ان کی پشت سے مخلوق کو نکالا پھر کہا: یہ جنت میں جائیں گے اور مجھے کچھ پروا نہیں۔ پھر کہا یہ جہنم میں جائیں گے اور مجھے کچھ پروا نہیں۔اس پر ایک پوچھنے والے نے پوچھا: پھر ہم عمل کس لیے کریں؟ آپ نے جواب دیا تقدیر کے پیدا شدہ مواقع کے مطابق عمل کرو۔''

مستدرک میں اس واقعے کے متعلق ایک اور روایت نقل ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ روایت زیر بحث روایت کا متن نہیں ہے، لیکن اس میں عہد الست کو ایک اور طریقے سے بیان کیا گیا ہے:

عن عباس عن النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم قال أخذ اللّٰہ المیثاق من ظھر آدم فأخرج من صلبہ ذریۃ ذراھا فنثرھم نثرا بین یدیہ کالذر ثم کلمھم فقال ألست بربکم قالوا بلی شھدنا أن تقولوا یوم القیامۃ إنا کنا عن ھذا غافلین أو تقولوا إنما أشرك آباؤنا من قبل و کنا ذریۃ من بعدھم أفتھلکنا بما فعل المبطلون؟ (المستدرک، رقم ۷۵)

''حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی پشتوں سے عہد لیا۔اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے آدم کی پیٹھ سے نسل آدم کو نکالا پھر اسے اپنے سامنے دانوں کی طرح بکھیر دیا۔ پھر ان سے کلام کیا اور پوچھا: کیا میں تمھارا مالک نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا: کیوں نہیں، ہم اس کا برملا اقرار کرتے ہیں۔(یہ ہم نے اس لیے کیا) کہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم اس (حقیقت) سے بے خبر تھے یا یہ کہو کہ شرک تو ہم سے پہلے ہمارے آبا نے کیا تھا، ہم تو ان کے بعد ان کی نسل سے ۔ کیا آپ ہمیں ان باطل پرستوں کے کیے پر ہلاک کر دیں گے؟''

واقعے کی یہ صورت قرآن مجید کے عین مطابق ہے۔ زیر بحث روایت اور اس کے متون قرآن مجید سے اتنی واضح

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مطابقت نہیں رکھتے۔

معنی

اس روایت کی توضیح سے پہلے قرآن مجید کے اس مقام کا مطالعہ مفید مطلب ہے جس کا ذکر اس روایت میں آیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ اِذۡ اَخَذَ رَبُّكَ مِنۡ بَنِىۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّيَّتَهُمۡ وَ اَشۡهَدَهُمۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ ، اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ ، قَالُوۡا بَلٰى ، شَهِدۡنَا ـ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنۡ هٰذَا غٰفِلِيۡنَ ـ اَوۡ تَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَشۡرَكَ اٰبَاۤؤُنَا مِنۡ قَبۡلُ وَ كُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنۡ بَعۡدِهِمۡ ، اَفَتُهۡلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ ـ (الاعراف ۷: ۱۷۲۔۱۷۳)

”اور یاد کرو، جب نکالا تمھارے رب نے بنی آدم سے، ان کی پیٹھوں سے، ان کی ذریت کو اور ان کو گواہ ٹھیرایا خود ان کے اوپر۔ پوچھا: کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ بولے، ہاں تو ہمارا رب ہے۔ ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ مبادا قیامت کو تم عذر کرو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے یا عذر کرو کہ ہمارے باپ دادا نے پہلے سے شرک کیا اور ہم ان کے بعد ان کے خلف ہوئے تو کیا باطل پرستوں کے عمل کی پاداش میں تو ہم کو ہلاک کرے گا۔“

مزید توضیح کے لیے ہم ”تدبر قرآن“ سے اہم نکات یہاں درج کریں گے:

”’من بنی آدم من ظھورھم‘ میں ’من ظھورھم‘، ’من بنی آدم‘ سے بدل واقع ہوا ہے اور اس بدل کے لانے سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ بنی آدم سے متعلق یہاں جو حقیقت بیان ہوئی ہے، وہ کسی خاص دور کے بنی آدم سے متعلق نہیں ہے۔

... اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا... یہ اقرار اللہ تعالیٰ نے اس صرف اس بات کا نہیں لیا کہ وہ اللہ ہے بلکہ اس بات کا بھی لیا کہ وہی رب بھی ہے۔ یہ ملحوظ رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ اہل عرب کو اللہ کے اللہ ہونے سے انکار نہیں تھا۔ لیکن رب انھوں نے اللہ کے سوا اور بھی بنا لیے تھے۔ حالانکہ عہد فطرت میں اقرار صرف اللہ ہی کی ربوبیت کا ہے۔“ (۳/ ۳۹۲)

مزید برآں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ اس واقعے کی وجہ سے اب انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہو گا کہ وہ اپنی بے خبری اور ماحول کے اثرات کو قیامت کے دن عذر کے طور پر پیش کر سکے۔ مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

”... جہاں تک توحید اور بدیہات فطرت کا تعلق ہے، ان کے باب میں قیامت کے دن مواخذہ ہر شخص سے مجرد اس

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اقرار کی بنا پر ہوگا جو مذکور ہوا۔قطع نظر اس کے کہ اس کو کسی نبی کی دعوت پہنچی یا نہیں۔

......اسی طرح ان لوگوں کا یہ عذر بھی کچھ کام نہ آئے گا کہ ہمارے باپ دادا مشرک تھے، ہم انھی کے ہاں پیدا ہوئے اور پھر قدرتی طور پر ہم نے انھی کے طریقے کی پیروی کی، اس وجہ سے یہ جرم ہمارا نہیں، بلکہ ان کا ہے۔اس کی سزا ان کو ملنی چاہیے نہ کہ ہم کو۔مطلب یہ ہوا کہ یہ اقرار توحید انسان کی فطرت کے اندر ودیعت ہے۔اس وجہ سے اس باطنی شہادت سے انحراف کے لیے خارجی اثرات کا عذر بھی کسی کا خدا کے ہاں مسموع نہیں ہوگا۔''(تدبر قرآن ۳/۳۹۳)

ان آیات میں تین باتیں روایت کے ظاہری معنی سے مختلف ہیں۔ایک یہ کہ تمام نسل انسانی کو حضرت آدم کی پشت سے نکالا گیا تھا۔قرآن مجید نے نہایت ایجاز کے اسلوب میں یہ بات بیان کی ہے کہ ہر شخص اسی ترتیب سے ظاہر ہوا جس ترتیب سے وہ دنیا میں پیدا ہو رہا ہے۔روایت کی یہ توجیہ کی جا سکتی ہے کہ اس میں اصل واقعے کی طرف محض اشارہ ہے۔لہٰذا اس کے اجمال کو قرآن مجید کی روشنی میں سمجھ لینا چاہیے۔لیکن روایت میں مذکور اگلی بات اس توجیہ کو ناقابل قبول بنا دیتی ہے۔یعنی یہ بات کہ آدم علیہ السلام کی کمر پر ایک مرتبہ ہاتھ پھیرا تو جنتی پیدا کر دیے اور دوسری مرتبہ ہاتھ پھیرا تو جہنمی۔بالبداہت واضح ہے کہ نسل انسانی میں جنتی اور جہنمی ملے جلے ہیں۔جب قرآن مجید کے مطابق نسل انسانی کو ان کی حقیقی ترتیب کے مطابق نکالا گیا تھا تو روایت میں جنتی اور جہنمی کی گروہ بندی دوسرے مرحلے کی حیثیت سے بیان ہونی چاہیے تھی۔

دوسری مختلف بات یہ کہ تخلیق کا یہ عمل جنتیوں اور جہنمیوں کو متعارف کرانے کے لیے کیا گیا تھا۔قرآن مجید سے یہ بالکل واضح ہے کہ یہ کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کے اقرار کا موقع ہے۔قرآن مجید سے یہ بھی واضح ہے کہ حق کے اقرار میں کسی نے کوئی پس و پیش نہیں کی۔جب سب نے حق قبول کر لیا۔اس کے باوجود یہ تقسیم کہ ایک گروہ جہنمی ہے اور ایک جنتی ایک بے محل بات لگتی ہے۔

تیسری مختلف بات یہ ہے کہ جنت اور جہنم کا فیصلہ تقدیر پر موقوف ہے۔یہ آیات واضح طور پر اللہ تعالیٰ کے کامل عدل کو بیان کرتی ہیں۔اس میں بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطرت میں حق ودیعت کیا ہے۔اس لیے کسی بھی شخص کو حق کے پہچاننے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔الست کا وعدہ لینے کا معاملہ اس لیے کیا گیا ہے تاکہ کوئی شخص اپنے ماحول کے برے اثرات یا اپنی بے علمی کو بطور عذر پیش نہ کر سکے۔اس آیت سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ دونوں عذر اہم ہیں اور اگر یہ حقیقی ہوتے تو عذاب سے چھٹکارے کا باعث بھی بن سکتے تھے۔روایت میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔اس میں یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ جنت اور جہنم کا فیصلہ ازل سے کر دیا گیا ہے۔

ان نکات کے متعین ہونے سے واضح ہے کہ روایت کے ان الفاظ کو درست ماننا ممکن نہیں ہے۔روایت اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی نسبت میں درست ہے تو یقیناً اس سے مختلف الفاظ میں ہوگی۔یہاں یہ بات واضح رہے کہ محدثین کے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نزدیک یہ روایت منقطع ہے۔یعنی سند کے اعتبار سے یہ ایک ضعیف روایت ہےاور ہماری توضیحات سے واضح ہے کہ متن کے اعتبار سے بھی محل نظر ہے۔

ہم اس سے پہلے کی روایات کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے غیب کے علم کی بنیاد پر یہ جان لیا ہے کہ کون جنت میں جائیں گےاور کون جہنم میں جائیں گے۔ممکن ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی موقع پر عہد الست کے واقعے کے ساتھ اس حقیقت کو بیان بھی کیا ہواور راویوں کے اس کے خلط ملط کر دینے کی وجہ سے روایت نے یہ صورت اختیار کر لی ہو۔اوپر درج متون کے مطالعے سے یہ امکان کافی قوی ہو جاتا ہے۔

باقی رہا'ففیم العمل' کا سوال تو یہ ایک اہم سوال ہے۔قرآن مجید واضح ہے کہ ہمیں عمل صالح وعمل بد اور حق اور باطل کے اپنانے کی پوری آزادی حاصل ہےاور ہم اسی آزمایش میں ڈالے گئے ہیں۔یہی اس دنیا کی تقدیر ہےاور ہمیں اسی کے مطابق عمل کرنا ہے۔اور غالباً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب'علی مواقع القدر'حقیقت معاملہ کے اسی پہلو پر مبنی ہے۔

کتابیات

ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، رقم ۳۰۰۱۔ ابوداؤد، کتاب السنہ، رقم ۴۰۸۱۔ مالک، کتاب الجامع، رقم ۱۳۹۵۔المستدرک، ۷۴۔۷۵۔۳۲۵۶۔۴۰۰۱۔ابن حبان، رقم ۳۳۸۔۶۱۶۶۔

دو کتابیں

عن عبد اللّٰہ بن عمر رضی اللّٰہ عنه قال : خرج رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ، و فی یدیه کتابان ـ فقال : أتدرون ما ھذان الکتابان ؟ قلنا : لا ، یا رسول اللّٰہ إلا أن تخبرنا ـ فقال الذی فی یدہ الیمنی : ھذا کتاب من رب العالمین ، فیه أسماء أھل الجنة ، وأسماء آبائھم و قبائلھم ، ثم أجمل علی آخرھم ، فلا یزاد فیھم ولا ینقص منھم أبدا ـ ثم قال الذی فی شماله : ھذا کتاب من رب العالمین ، فیه أسماء أھل

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

النـار وأسماء آبائهم و قبائلهم ، ثم أجمل على آخرهم ، فلا يزاد فيهم ولا ينـقـص مـنهم أبدا ـ فقال أصحابه : ففيم العمل يا رسول اللّٰه ، إن كـان أمر قد فرغ منه ؟ فقال سددوا وقاربوا ، فإن صاحب الجنة يختم لـه بـعـمـل أهل الجنة و إن عمل أى عمل ـ وإن صاحب النار يختم له بـعـمل أهل النار وإن عمل أى عمل ـثم قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسـلـم بيـديـه فنبذهما قال فرغ ربكم من العباد فريق فى الجنة و فريق فى السعير۔

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اور آپ کے ہاتھوں میں دو کتابیں تھیں۔ آپ نے پوچھا، جانتے ہو یہ دو کتابیں کیا ہیں؟ ہم نے کہا کہ نہیں یا رسول اللہ الا ّیہ کہ آپ ہمیں بتا دیں۔ پھر آپ نے اپنے دائیں ہاتھ والی کتاب کے بارے میں بتایا: یہ کتاب پروردگار عالم کی طرف سے ہے۔ اس میں اہل جنت کے نام ہیں۔ اور ان کے آبا اور قبیلوں کے نام ہیں۔ آخر میں حساب مکمل کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ نہ اس میں کبھی کوئی کمی ہوگی نہ اس میں کوئی اضافہ ہوگا۔ پھر اپنے بائیں ہاتھ والی کتاب کے بارے میں فرمایا: اس میں اہل جہنم کے نام ہیں۔ اور ان کے آبا اور ان کے قبیلوں کے نام ہیں۔ پھر آخر میں حساب کر دیا گیا ہے۔ نہ اس میں کوئی اضافہ ہو گا نہ اس میں کبھی کوئی کمی ہوگی۔ صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ اگر صورت یہ ہے کہ معاملہ نمٹا دیا گیا ہے تو عمل کس لیے؟ آپ نے فرمایا: اپنا معاملہ سیدھا اور درست رکھو اور اس طرح اللہ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرو، کیونکہ اہل جنت کے لیے طے کر دیا جاتا ہے کہ ان کی آخری زندگی اہل جنت کے عمل والی ہوگی خواہ انھوں نے کوئی بھی عمل کیا ہو۔ اسی طرح اہل جہنم کے لیے طے ہوتا ہے کہ ان کی آخری زندگی جہنمیوں والے اعمال کی ہوگی خواہ انھوں نے کوئی بھی عمل کیا ہو۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

نے اپنے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا۔ پھر آپ نے دونوں (کتابیں) پھینک دیں۔ آپ نے فرمایا: ان بندوں کا معاملہ طے کر کے تمھارا پروردگار فارغ ہو چکا ہے۔ ایک فریق جنت میں ہے اور ایک جہنم میں۔''

لغوی مباحث

أجمل علی آخرھم : اس کے آخر میں خلاصہ کر دیا گیا ہے۔ یہ حساب کے مکمل کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ یعنی پہلے تفصیلی حساب لکھا جاتا ہے۔ آخر میں اہم حاصلات کو ایک سمری کی صورت میں درج کر دیا جاتا ہے۔ یعنی اس معاملے کی لکھت پڑھت مکمل ہو گئی ہے۔ اب اس میں نہ کوئی اضافہ پیش نظر ہے اور نہ اس میں کسی ترمیم کا اب کوئی امکان ہے۔

سددوا و قاربوا : تسدید کا مطلب سیدھا کرنا یا سیدھی راہ پر چلنا ہے۔ مقاربت کے معنی قریب ہونے یا بیچ کی راہ اختیار کرنے کے ہیں۔ یہاں ان کے مفعول بہ بربنائے قرینہ حذف ہیں۔ ہمارے نزدیک پوری بات یوں ہے: سددوا اعمالکم و قاربوا اللّٰہ۔

فنبذھما : پھر آپ نے ان کتابوں کو پھینک دیا۔ یہ جملہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ اس سے ان کتابوں کی اہانت کا پہلو نکلتا ہے۔ اس کے دو حل کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ کتابیں اوپر کی طرف پھینکی گئیں۔ یعنی جس طرف سے آئی تھیں ادھر واپس کر دیں۔ دوسرے یہ کہ کتابیں غیر مرئی تھیں۔ لوٹانے کے اشارے کو راوی نے ان الفاظ سے تعبیر کر دیا ہے۔ بظاہر روایت زیادہ امکان اسی کا ہے کہ کتابیں غیر مرئی نہیں تھیں، جب آپ نے بات مکمل کر لی آپ نے انھیں لوٹا دیا۔

فرغ ربکم بالعباد : تمھارا پروردگار ان بندوں کے معاملے سے فارغ ہو گیا۔ یعنی یہ معاملہ نمٹا دیا گیا ہے۔

متون

یہ روایت بھی کم و بیش انھی الفاظ میں مروی ہے۔ چند لفظی اختلافات ہیں۔ مثلاً، ایک روایت میں 'ھذا کتاب من رب العالمین فیہ أسماء......' کے بجائے 'ھذا کتاب أھل النار ......' کے الفاظ ہیں اور ایک دوسری روایت میں آخری جملہ 'العمل بخواتمہ' یا 'فالعمل الی خاتمہ' ہے۔ المعجم الاوسط میں یہ روایت کافی مختلف انداز میں نقل ہوئی ہے۔ مثلاً، روایت کا آغاز اس طرح سے ہوا ہے:

صعد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر چڑھے۔ آپ نے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

على المنبر فحمد اللّٰه و اثنى عليه و قال كتاب كتبه اللّٰه فيه أسماء......۔ (رقم ۵۲۱۹)	اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی ۔ پھر آپ نے فرمایا : یہ ایک کتاب ہے ۔ اسے اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے ۔ اس میں نام ہیں......''

آگے کی تفصیلات بھی اگر چہ مختلف الفاظ میں بیان ہوئی ہیں، لیکن معنی کے اعتبار سے کوئی اہم فرق نہیں ہے ۔

معنی

اس روایت میں ایک اہم واقعہ بیان ہوا ہے ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن باہر آئے تو آپ کے ہاتھوں میں دو کتابیں تھیں ۔ آپ نے بتایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور ایک کتاب میں اہل جنت کے نام نسب کے ساتھ لکھے ہوئے ہیں اور دوسری میں اہل جہنم کے ۔ حساب مکمل کر دیا گیا ہے اور اب اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو گی ۔ لوگوں نے بجا طور پر پوچھا ہے کہ اب ہمیں عمل کی کیا ضرورت ہے ۔ آپ نے بتایا کہ ہر ایک کا فیصلہ اس کی موت تک کے اعمال کی بنیاد پر ہو گا، چنانچہ اپنے عمل ٹھیک رکھو اور خدا کی رضا اور قرب پانے کی کوشش کرتے رہو ۔

شارحین نے روایت کو تمام انسانوں سے متعلق لیا ہے اور اسے تقدیر کے بیان کے معنی ہی میں لیا ہے ۔ گویا ان کے نزدیک اس روایت کا مضمون بھی وہی ہے جو اس سے پہلے کی روایات میں بیان ہو چکا ہے ۔ اس روایت سے البتہ، ایک اضافی بات معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام بنی آدم کے جنتیوں اور جہنمیوں کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا تھا ۔ بظاہر اس روایت کے یہی معنی ہیں ۔ ہم حسب سابق یہاں بھی یہی وضاحت کرتے کہ یہ علم کا بیان ہے ۔ اس سے کوئی جبر لازم نہیں آتا ۔ یعنی اس روایت کے وہ معنی نہیں لیے جا سکتے جو اللہ تعالیٰ کے قانون آزمایش اور نظام عدل کی نفی کرتے ہوں ۔ لیکن اس روایت میں ایک قرینہ ایسا ہے جس سے تمام انسانوں کے بجائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین تک محدود کرنے کا اشارہ ملتا ہے ۔ وہ قرینہ یہ ہے کہ آپ نے بتایا کہ اس میں اہل جنت اور اہل جہنم کے نام ولدیت اور قبیلے کی صراحت کے ساتھ لکھے گئے ہیں ۔ گویا یہ کتابیں اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کا اعلان تھیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انذار کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے صادر ہوا تھا ۔ اور اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کار رسالت کے مکمل ہونے کا اشارہ بھی تھا اور آپ کے حقیقی دوستوں یعنی اہل ایمان اور دشمنوں یعنی اہل کفر و نفاق کے بارے میں تصریح بھی تھی ۔

اگر اس روایت کے یہ معنی درست ہیں تو اس واقعے کے ظہور کا زمانہ سورۂ توبہ کے نزول سے ملحق ہونا چاہیے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سورۂ توبہ قرآن مجید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کار رسالت کی تکمیل کی سورہ ہے ۔ استاذ محترم جناب جاوید احمد غامدی کی تصریح کے مطابق اس سورہ میں اہل ایمان اور اہل کفر و نفاق کے تمام طبقات کا انجام بیان ہوا ہے ۔ چنانچہ یہی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

موقع سب سے زیادہ موزوں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے تمام مخاطبین کی اصل حقیقت یعنی آخری انجام بتا دیا جائے۔

ضمنی طور پر یہ بات واضح رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کتابوں سے حاصل ہونے والی معلومات سے کسی کو آگاہ نہیں کیا تھا۔ آپ نے یہ بات صحابہ کو صرف اس پہلو سے بتائی ہے کہ مجھے اتمام حجت کی جس ذمہ داری پر فائز کیا گیا تھا، وہ مکمل ہوگئی ہے اور اس کے نتائج بھی مرتب و معین ہوگئے ہیں۔

کتابیات

المعجم الاوسط، رقم ۵۲۱۹۔ ترمذی، رقم ۲۰۶۷۔ مسند احمد ۶۲۷۵۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

قانون معاشرت

(۱۰)

(گزشتہ سے پیوستہ)

طلاق کا طریقہ

شوہر خود طلاق دے یا بیوی کے مطالبے پر اسے علیحدہ کر دینے کا فیصلہ کرے، دونوں ہی صورتوں میں اس کا جو طریقہ ان آیات میں بتایا گیا ہے، وہ یہ ہے:

ا۔ طلاق عدت کے لحاظ سے دی جائے گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بیوی کو فوراً علیحدہ کر دینے کے لیے طلاق دینا جائز نہیں ہے۔ یہ جب دی جائے گی، ایک متعین مدت کے پورا ہو جانے پر مفارقت کے ارادے سے دی جائے گی۔ عدت کا لفظ اصطلاح میں اس مدت کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں بیوی شوہر کی طرف سے طلاق یا اس کی وفات کے بعد کسی دوسرے شخص سے نکاح نہیں کر سکتی۔ یہ مدت چونکہ اصلاً مقرر ہی اس لیے کی گئی ہے کہ عورت کے پیٹ کی صورت حال پوری طرح واضح ہو جائے، اس لیے ضروری ہے کہ بیوی کو حیض سے فراغت کے بعد اور اس سے زن و شو کا تعلق قائم کیے بغیر طلاق دی جائے۔ ہر مسلمان کو اس معاملے میں اس غصے کے باوجود جو اس طرح کے موقعوں پر بیوی کے خلاف پیدا ہو جاتا ہے، اللہ، اپنے پروردگار سے ڈرنا چاہیے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبد اللہ کے بارے میں بتایا گیا کہ اس نے ایام حیض میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے تو آپ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا:

مرہ فلیراجعھا، ثم یمسکھا حتی تطھر، ثم تحیض ثم تطھر، ثم إن شاء امسك بعد، و إن شاء طلق قبل ان	''اس کو حکم دو کہ رجوع کرے، پھر اسے اپنی زوجیت میں روکے رکھے، یہاں تک کہ وہ پاک ہو، پھر حیض آئے، پھر پاک ہو۔[29] اس کے بعد چاہے تو روک لے اور

۲۹؎ یہ دوسری مرتبہ حیض سے پاک ہو جانے تک طلاق نہ دینے کا حکم اس لیے دیا ہے کہ حمل کے بارے میں، جس حد تک ممکن ہو، پورا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یمس، فتلك العدة التی امر اللّٰه ان تطلق لها النساء۔ (بخاری، رقم ۵۲۵۱)

چاہے تو ملاقات سے پہلے طلاق دے دے۔ اس لیے کہ یہی اس عدت کی ابتدا ہے جس کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو طلاق دینے کی ہدایت فرمائی ہے۔''

اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ عدت کا شمار پوری احتیاط کے ساتھ کیا جائے۔ طلاق کا معاملہ چونکہ نہایت نازک ہے، اس سے عورت اور مرد اور ان کی اولاد اور ان کے خاندان کے لیے بہت سے قانونی مسائل پیدا ہوتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ جب طلاق دی جائے تو اس کے وقت اور تاریخ کو یاد رکھا جائے اور یہ بھی یاد رکھا جائے کہ طلاق کے وقت عورت کی حالت کیا تھی، عدت کی ابتدا کس وقت ہوئی ہے، یہ کب تک باقی رہے گی اور کب ختم ہو جائے گی۔ معاملہ گھر میں رہے یا خدانخواستہ کسی مقدمے کی صورت میں عدالت تک پہنچے، دونوں صورتوں میں اسی سے متعین کیا جائے گا کہ شوہر کو رجوع کا حق کب تک ہے، اسے عورت کو گھر میں کب تک رکھنا ہے، نفقہ کب تک دینا ہے، وراثت کا فیصلہ کس وقت کے لحاظ سے کیا جائے گا، عورت اس سے کب جدا ہوگی اور کب اسے دوسرا نکاح کر لینے کا حق حاصل ہو جائے گا۔

۲۔ عدت کے پورا ہونے تک شوہر کو رجوع کا حق ہے۔ 'فاذا ابلغن اجلهن فامسكوهن بمعروف او فارقوهن بمعروف' (پھر جب وہ اپنی عدت کے خاتمے تک پہنچ جائیں تو یا انھیں بھلے طریقے سے نکاح میں رکھو یا بھلے طریقے سے الگ کر دو) کے الفاظ میں یہ بات قرآن نے ان آیات میں واضح کر دی ہے۔ پھر سورۂ بقرہ میں مزید وضاحت فرمائی ہے کہ طلاق کی طرح رجوع کا یہ حق بھی شوہر کو اس لیے دیا گیا ہے کہ خاندان کے نظم کو قائم رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بیوی کے مقابلے میں اس کے لیے ایک درجہ ترجیح کا رکھا ہے۔ تاہم اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ حقوق صرف شوہروں کے ہیں، بیویوں کا کوئی حق نہیں ہے۔ لوگوں کو متنبہ رہنا چاہیے کہ عورتوں پر جس طرح ان کے شوہروں سے متعلق حقوق ہیں، اسی طرح ان کے بھی حقوق ہیں۔ بنی آدم کے لیے یہ حقوق کوئی اجنبی چیز نہیں ہیں۔ وہ ان سے ہمیشہ واقف رہے ہیں۔ لہٰذا شوہروں کا فرض ہے کہ وہ اپنے حقوق کے مطالبے کے ساتھ دستور کے مطابق بیوی کے حقوق کا بھی لحاظ کریں:

وَبُعُوۡلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ، اِنۡ اَرَادُوۡۤا اِصۡلَاحًا، وَلَهُنَّ مِثۡلُ الَّذِيۡ عَلَيۡهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ، وَلِلرِّجَالِ عَلَيۡهِنَّ دَرَجَةٌ، وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ۔ (۲:۲۲۸)

''اور اُن کے شوہر اگر معاملات کی اصلاح چاہیں تو اس عدت کے دوران میں انھیں لوٹا لینے کے زیادہ حق دار ہیں، اور ان عورتوں پر دستور کے مطابق جیسے حقوق ہیں، اسی طرح اُن کے بھی حقوق ہیں۔ (شوہر کی حیثیت سے) البتہ، مردوں کے لیے اُن پر ایک درجہ ترجیح کا ہے۔ (یہ اللہ کا حکم ہے) اور اللہ عزیز و حکیم ہے۔''

اطمینان ہو جائے۔

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

اس طرح کے معاملات چونکہ جذبات پر مبنی اقدامات اور افراط و تفریط کے رویوں کا باعث بن سکتے اور لوگ اس میں چند در چند غلطیوں کا ارتکاب کر سکتے ہیں، اس لیے آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنی دو صفات ـــــ عزیز و حکیم ـــــ کا حوالہ دیا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی ان کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''خدا عزیز ہے، اس وجہ سے اسی کو حق ہے کہ وہ حکم دے اور وہ حکیم ہے، اس وجہ سے جو حکم بھی اس نے دیا ہے، وہ سراسر حکمت پر مبنی ہے۔ بندوں کا کام یہ ہے کہ اس کے احکام کی بے چون و چرا اطاعت کریں۔ اگر وہ اس کے احکام کی مخالفت کریں گے تو اس کی غیرت و عزت کو چیلنج کریں گے اور اس کے عذاب کو دعوت دیں گے، اور اگر خدا سے زیادہ حکیم اور مصلحت شناس ہونے کے خبط میں مبتلا ہوں گے تو خود اپنے ہاتھوں اپنے قانون اور نظام سب کا تیاپانچا کر کے رکھ دیں گے۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۵۳۳)

۳۔ شوہر رجوع نہ کرے تو عدت کے پورا ہو جانے پر میاں بیوی کا رشتہ ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ ہدایت فرمائی ہے کہ یہ خاتمے کو پہنچ رہی ہو تو شوہر کو فیصلہ کر لینا چاہیے کہ اسے بیوی کو روکنا ہے یا رخصت کر دینا ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں اللہ کا حکم ہے کہ معاملہ معروف کے مطابق، یعنی بھلے طریقے سے کیا جائے۔ فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہوئے یہ فیصلے کریں گے، انھیں مطمئن رہنا چاہیے کہ اگر کوئی مشکل پیش آئی تو اللہ ان کے لیے اس سے نکلنے کا راستہ پیدا کر دے گا۔

سورۂ بقرہ میں اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ روکنا مقصود ہو تو یہ ہرگز ہرگز دست ستم دراز کرنے کے لیے نہیں ہونا چاہیے۔ اس سورہ کی جو آیت اوپر نقل ہوئی ہے، اس میں 'ان ارادوا اصلاحاً' کی شرط اسی لیے عائد کی گئی ہے کہ رجوع اس ارادے سے نہ ہو کہ بیوی کو اپنی خواہش کے مطابق اذیت دی جا سکے، بلکہ محبت اور سازگاری کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے ہو، ورنہ یہ محض ظلم ہوگا جو قیامت میں اللہ تعالیٰ کی شدید ناراضی کا باعث بن جائے گا۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ، وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا، وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ، وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا، وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ، يَعِظُكُمْ بِهٖ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ، وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ (البقرہ ۲: ۲۳۱)

''اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت کے خاتمے پر پہنچ جائیں تو یا انھیں بھلے طریقے سے روک لو یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔ اور انھیں نقصان پہنچانے کے ارادے سے نہ روکو کہ ان پر زیادتی کرو۔ اور (جان لو کہ) جو ایسا کرے گا، وہ درحقیقت اپنی ہی جان پر ظلم ڈھائے گا۔ اور اللہ کی آیتوں کو مذاق نہ بناؤ اور اپنے اوپر اللہ کی عنایت کو یاد رکھو اور اس قانون اور حکمت کو یاد رکھو جو اس نے اتاری ہے، جس کی وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور خوب جان رکھو کہ اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

استاذ امام اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''مثبت پہلو سے بات اوپر کہہ چکنے کے بعد منفی پہلو سے بھی اس کی وضاحت اس لیے کر دی گئی کہ ظالم لوگ طلاق اور طلاق کے بعد مراجعت کے شوہری حق کو اس ظلم کے لیے استعمال کر سکتے تھے، حالانکہ یہ صریح اعتدا، یعنی اللہ کے حدود سے تجاوز اور اس کی شریعت کو مذاق بنانا ہے۔ فرمایا کہ جو ایسی جسارت کرتے ہیں، بظاہر تو وہ ایک عورت کو نشانۂ ظلم بناتے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ سب سے بڑا ظلم اپنی جان پر کرتے ہیں، کیونکہ اللہ کے حدود کو پھاندنے اور اس کی شریعت کو مذاق بنانے کی سزا بڑی ہی سخت ہے۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو کہ اس نے تمھیں ایک برگزیدہ امت کے منصب پر سرفراز فرمایا، تمھاری ہدایت کے لیے تمھارے اندر اپنا نبی بھیجا، تمھیں خیر و شر اور نیک و بد سے آگاہ کرنے کے لیے تمھارے اوپر اپنی کتاب اتاری جو قانون اور حکمت، دونوں کا مجموعہ ہے۔ اللہ کی ایسی عظیم نعمتیں پانے کے بعد اگر تم نے ان کا یہی حق ادا کیا کہ خدا کے حدود کو توڑا اور اس کی شریعت کو مذاق بنایا تو سوچ لو کہ ایسے لوگوں کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ پھر فرمایا کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان رکھو کہ وہ تمھاری ہر بات سے باخبر ہے، یعنی وہ لوگوں کی شرارتوں کے باوجود ان کو ڈھیل تو دیتا ہے، لیکن جب وہ پکڑے گا تو اس کی پکڑ سے کوئی بھی چھوٹ نہ سکے گا۔'' (تدبر قرآن ۱/۵۳۹)

اسی طرح رخصت کر دینے کا فیصلہ ہو تو 'تسریح باحسان' کا حکم دیا ہے: 'فامساك بمعروف او تسریح باحسان'[۳۰]، یعنی بیوی کو اچھے طریقے سے رخصت کیا جائے۔ اس باب میں جو ہدایات خود قرآن میں دی گئی ہیں، وہ یہ ہیں:

اولاً، بیوی کو کوئی مال، جائداد، زیورات اور ملبوسات وغیرہ، خواہ کتنی ہی مالیت کے ہوں، اگر تحفے کے طور پر دیے گئے ہیں تو ان کا واپس لینا جائز نہیں ہے۔ نان نفقہ اور مہر تو عورت کا حق ہے، ان کے واپس لینے یا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے علاوہ جو چیزیں دی گئی ہوں، ان کے بارے میں بھی قرآن کا حکم ہے کہ وہ ہرگز واپس نہیں لی جا سکتیں۔

اس سے دو صورتیں، البتہ مستثنیٰ ہیں:

ایک یہ کہ میاں بیوی میں حدود الٰہی کے مطابق نباہ ممکن نہ رہے، معاشرے کے ارباب حل و عقد بھی یہی محسوس کریں، لیکن میاں صرف اس لیے طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو کہ اس کے دیے ہوئے اموال بھی ساتھ ہی جائیں گے تو بیوی یہ اموال یا ان کا کچھ حصہ واپس کر کے شوہر سے طلاق لے سکتی ہے۔ اس طرح کی صورت حال اگر کبھی پیدا ہو جائے تو شوہر کے لیے اسے لینا ممنوع نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ بیوی کھلی ہوئی بدکاری کا ارتکاب کرے۔ اس سے میاں بیوی کے رشتے کی بنیاد ہی چونکہ منہدم ہو جاتی ہے، لہٰذا شوہر کے لیے جائز ہے کہ اس صورت میں وہ اپنا دیا ہوا مال اس سے واپس لے لے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

۳۰۔ البقرہ ۲: ۲۲۹۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْاً ، اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ، فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ، فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ، تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا، وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ ، فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ـ

(البقرہ۲:۲۲۹)

''اور تمھارے لیے جائز نہیں ہے کہ تم نے جو کچھ ان عورتوں کو دیا ہے، اس میں سے کچھ بھی (اس موقع پر) واپس لو۔ یہ صورت ، البتہ مستثنیٰ ہے کہ دونوں کو حدود الٰہی پر قائم نہ رہ سکنے کا اندیشہ ہو۔ پھر اگر تمھیں بھی اندیشہ ہو کہ وہ حدود الٰہی پر قائم نہیں رہ سکتے تو (شوہر کی دی ہوئی) ان چیزوں کے معاملے میں ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے جو عورت فدیے میں دے کر طلاق حاصل کر لے۔ یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں۔ سو ان سے آگے نہ بڑھو۔ اور (جان لو کہ) جو اللہ کے حدود سے آگے بڑھتے ہیں، وہی ظالم ہیں۔''

وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ... وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ـ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ، وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ ، وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ـ

(النساء۴:۱۹۔۲۱)

''اور نہ یہ جائز ہے کہ جو کچھ انھیں دے چکے ہو، اُس کا کچھ حصہ اڑا لینے کے لیے انھیں تنگ کرو، ہاں اس صورت میں کہ وہ کھلی ہوئی بدچلنی کی مرتکب ہوں... اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانا چاہو تو خواہ تم نے اسے ڈھیروں مال دیا ہو، اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔ کیا تم بہتان لگا کر اور صریح حق تلفی کر کے اسے واپس لو گے؟ اور آخر کس طرح لو گے، جبکہ تم ایک دوسرے کے لیے بے حجاب ہو چکے ہو اور (نکاح کے موقع پر) وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس دوسری صورت کے لیے تنبیہ فرما دی ہے کہ کوئی شخص بیوی پر بہتان لگا کر اس سے دیا ہوا مال واپس لینے کے لیے جواز پیدا کرنے کی جسارت نہ کرے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہ مرد کی فتوت کے بالکل منافی ہے کہ جس عورت کے ساتھ اس نے زندگی بھر کا پیمان وفا باندھا، جو ایک نہایت مضبوط میثاق کے تحت اس کے حبالۂ عقد میں آئی، جس نے اپنا سب ظاہر و باطن اس کے لیے بے نقاب کر دیا اور دونوں نے ایک مدت تک یک جان و دو قالب ہو کر زندگی گزاری، اس سے جب جدائی کی نوبت آئے تو اپنا کھلایا پہنایا اس سے اگلوانے کی کوشش کی جائے، یہاں تک کہ اس ذلیل غرض کے لیے اس کو بہتانوں اور تہمتوں کا ہدف بھی بنایا جائے۔'' (تدبر قرآن ۲/۲۷۱)

ثانیاً، عورت کو ہاتھ لگانے یا اس کا مہر مقرر کرنے سے پہلے طلاق دے دی جائے تو مہر کے معاملے میں شوہر پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، لیکن مہر مقرر ہو اور ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق کی نوبت پہنچ جائے تو مقررہ مہر کا نصف ادا کرنا ہوگا، الاّ یہ کہ عورت

اپنی مرضی سے پورا چھوڑ دے یا مرد پورا ادا کر دے۔ ارشاد فرمایا ہے:

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ، اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَالَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ... وَّاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ، وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً، فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ ، اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِیْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ، وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ، وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ، اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۔ (البقرہ ۲: ۲۳۶۔ ۲۳۷)

''اور اگر تم عورتوں کو طلاق دو، اس سے پہلے کہ تم نے انھیں ہاتھ لگایا ہو یا ان کا مہر مقرر کیا ہو تو (مہر کے معاملے میں) تم پر کچھ گناہ نہیں ہے ... اور اگر تم نے طلاق تو انھیں ہاتھ لگانے سے پہلے دی، مگر مہر مقرر کر چکے ہو تو مقررہ مہر کا نصف انھیں دینا ہوگا، الّا یہ کہ وہ اپنا حق چھوڑ دیں یا وہ چھوڑ دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔ اور یہ کہ تم مرد اپنا حق چھوڑ دو، یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔ اور اپنے درمیان کی فضیلت نہ بھولو۔ بے شک، اللہ دیکھ رہا ہے اس کو جو تم کر رہے ہو۔''

استاذ امام امین احسن اصلاحی نے ان آیات کی تفسیر میں لکھا ہے:

''اگرچہ ایک محرک عورت کے لیے بھی مہر چھوڑنے کا موجود ہے کہ شوہر نے ملاقات سے پہلے ہی طلاق دی ہے، لیکن قرآن نے مرد کو اکسایا ہے کہ اس کی فتوت اور مردانہ بلند حوصلگی اور اس کے درجے مرتبے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ عورت سے اپنے حق کی دستبرداری کا خواہش مند نہ ہو، بلکہ اس میدان ایثار میں خود آگے بڑھے۔ اس ایثار کے لیے قرآن نے یہاں مرد کو تین پہلوؤں سے ابھارا ہے: ایک تو یہ کہ مرد کو خدا نے یہ فضیلت بخشی ہے کہ وہ نکاح کی گرہ کو جس طرح باندھنے کا اختیار رکھتا ہے، اسی طرح اس کو کھولنے کا بھی مجاز ہے۔ دوسرا یہ کہ ایثار و قربانی جو تقویٰ کے اعلیٰ ترین اوصاف میں سے ہے، وہ جنس ضعیف کے مقابل میں جنس قوی کے شایان شان زیادہ ہے۔ تیسرا یہ کہ مرد کو خدا نے اس کی صلاحیتوں کے اعتبار سے عورت پر جو ایک درجہ ترجیح کا بخشا ہے اور جس کے سبب سے اس کو عورت کا قوام اور سربراہ بنایا ہے، یہ ایک بہت بڑی فضیلت ہے جس کو عورت کے ساتھ کوئی معاملہ کرتے وقت مرد کو بھولنا نہیں چاہیے۔ اس فضیلت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ مرد عورت سے لینے والا نہیں، بلکہ اس کو دینے والا بنے۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۵۴۸)

ثالثاً عورت کو کچھ سامان زندگی دے کر رخصت کیا جائے۔ قرآن نے اسے اللہ سے ڈرنے والوں اور احسان کا رویہ اختیار کرنے والوں پر ایک حق قرار دیا ہے۔ طلاق اگر عورت کو ہاتھ لگائے بغیر بھی دی گئی ہے تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ حق ادا ہونا چاہیے:

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ، حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ۔ (البقرہ ۲: ۲۴۱)

''اور مطلقہ عورتوں کو بھی دستور کے مطابق زندگی کا کچھ سامان دے کر رخصت کرنا ہے۔ یہ حق ہے اُن پر جو خدا سے ڈرنے والے ہوں۔''

سورۂ احزاب (۳۳) کی آیت ۴۹ میں یہی بات 'فمتعوهن و سرحوهن سراحاً جميلاً' (لیکن انھیں کچھ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سامان دو اور بھلے طریقے سے رخصت کر دو) کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ بقرہ میں ان عورتوں کے متعلق بھی اسی کا حکم دیا ہے جن سے خلوت نہ ہوئی ہو یا جنھیں مہر مقرر کیے بغیر طلاق دے دی جائے۔ قرآن کی ہدایت ہے کہ اس کی مقدار آدمی کو سوسائٹی کے دستور اور اپنے معاشی حالات کی رعایت سے متعین کرنی چاہیے:

وَّمَتِّعُوْهُنَّ، عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ، حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ۔ (۲:۲۳۶)

''اور انھیں دستور کے مطابق کچھ سامان زندگی دے کر رخصت کرو، اچھی حالت والے اپنی حالت کے مطابق اور غریب اپنی حالت کے مطابق۔ یہ حق ہے ان پر جو احسان کا رویہ اختیار کرنے والے ہوں۔''

اس سے واضح ہے کہ یہ ایک حق واجب ہے۔ اگر کوئی شخص اسے ادا نہیں کرتا تو تقویٰ اور احسان کی صفات پر مبنی ہونے کی وجہ سے قانون چاہے اس پر گرفت نہ کر سکے، لیکن اللہ کے ہاں وہ اس پر یقیناً ماخوذ ہو گا اور آخرت میں اس کے ایمان و احسان کا وزن اس کے لحاظ سے متعین کیا جائے گا۔

۴۔ عدت کے دوران میں شوہر رجوع کر لے تو عورت بدستور اس کی بیوی رہے گی، لیکن اس کے معنی کیا یہ ہیں کہ شوہر اسی طرح جب چاہے بار بار طلاق دے کر عدت میں رجوع کر سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب قرآن نے یہ دیا ہے کہ طلاق اور طلاق کے بعد رجوع کا یہ حق ہر شخص کو ایک رشتۂ نکاح میں دو مرتبہ حاصل ہے: 'الطلاق مرتان، فامساك بمعروف او تسريح باحسان'[۱۳۱] (اس طلاق کا حق دو مرتبہ ہے، پھر بھلے طریقے سے روک لینا ہے یا خوبی کے ساتھ رخصت کر دینا ہے)۔ یعنی آدمی طلاق دے کر رجوع کر لے تو عورت کے ساتھ اس کی پوری ازدواجی زندگی میں اس کو ایک مرتبہ پھر اسی طرح طلاق دے کر عدت کے دوران میں رجوع کر لینے کا حق حاصل ہے، لیکن اس کے بعد یہ حق باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ ایک رشتۂ نکاح میں دو مرتبہ رجوع کے بعد تیسری مرتبہ پھر علیحدگی کی نوبت آ گئی اور شوہر نے طلاق دے دی تو اس کے نتیجے میں عورت ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو جائے گی، الّا یہ کہ اس کا نکاح کسی دوسرے شخص کے ساتھ ہو اور وہ بھی اسے طلاق دے دے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ، فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ، اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ، وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔ (البقرہ۲:۲۳۰)

''پھر اگر اُس نے (تیسری مرتبہ) طلاق دے دی تو اس کے بعد وہ عورت اس کے لیے جائز نہ ہو گی، جب تک اس کے سوا کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے۔ پھر اگر اس نے بھی طلاق دے دی تو ان دونوں کے لیے ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لینے میں کوئی مضایقہ نہیں، اگر یہ توقع رکھتے ہوں کہ اب وہ حدود الٰہی پر قائم رہ سکیں گے۔ اور یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں جنھیں وہ

---

۱۳۱ البقرہ۲:۲۲۹۔

ان لوگوں کے لیے واضح کر رہا ہے جو جاننا چاہتے ہیں۔"

پہلے شوہر کے ساتھ نکاح کے لیے قرآن نے اس آیت میں تین شرطیں بیان فرمائی ہیں:

ایک یہ کہ عورت کسی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح کرے۔

دوسری یہ کہ اس سے بھی نباہ نہ ہو سکے اور وہ اسے طلاق دے دے۔

تیسری یہ کہ وہ دونوں سمجھیں کہ دوبارہ نکاح کے بعد اب وہ حدود الٰہی پر قائم رہ سکیں گے۔

پہلی اور دوسری شرط میں نکاح سے مراد عقد نکاح اور طلاق سے مراد وہی طلاق ہے جو آدمی نباہ نہ ہونے کی صورت میں علیحدگی کا فیصلہ کر لینے کے بعد اپنی بیوی کو دیتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"اصل یہ ہے کہ لفظ نکاح شریعت اسلامی کی ایک معروف اصطلاح ہے جس کا اطلاق ایک عورت اور مرد کے اس ازدواجی معاہدے پر ہوتا ہے جو زندگی بھر کے نباہ کے ارادے کے ساتھ زن و شو کی زندگی گزارنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اگر یہ ارادہ کسی نکاح کے اندر نہیں پایا جاتا تو وہ فی الحقیقت نکاح ہی نہیں ہے، بلکہ وہ ایک سازش ہے جو ایک عورت اور ایک مرد نے باہم مل کر کر لی ہے۔ نکاح کے ساتھ شریعت نے طلاق کی جو گنجایش رکھی ہے تو وہ اصل اسکیم کا کوئی جز نہیں ہے، بلکہ یہ کسی ناگہانی افتاد کے پیش آ جانے کا ایک مجبورانہ مداوا ہے۔ اس وجہ سے نکاح کی اصل فطرت یہی ہے کہ وہ زندگی بھر کے سنجوگ کے ارادے کے ساتھ عمل میں آئے۔ اگر کوئی نکاح واضح طور پر محض ایک معین و مخصوص مدت تک ہی کے لیے ہو تو اس کو متعہ کہتے ہیں اور متعہ اسلام میں قطعی حرام ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اس نیت سے کسی عورت سے نکاح کرے کہ اس نکاح کے بعد طلاق دے کر وہ اس عورت کو اس کے پہلے شوہر کے لیے جائز ہونے کا حیلہ فراہم کرے تو شریعت کی اصطلاح میں یہ حلالہ ہے اور یہ بھی اسلام میں متعہ ہی کی طرح حرام ہے۔ جو شخص کسی کی مقصد برآری کے لیے یہ ذلیل کام کرتا ہے، وہ درحقیقت ایک قرم ساق یا بھڑوے یا جیسا کہ حدیث میں وارد ہے 'کرایے کے سانڈ' کا رول ادا کرتا ہے اور ایسا کرنے والے اور ایسا کروانے والے پر اللہ کی لعنت ہے[۳۲]۔" (تدبر قرآن ۱/۵۳۷)

تیسری شرط اس لیے عائد کی گئی ہے کہ نکاح و طلاق کو لوگ بچوں کا کھیل نہ سمجھیں اور متنبہ رہیں کہ کسی عورت کو طلاق دینی ہے تو خدا سے ڈرتے ہوئے اور نباہ کی کوئی صورت نہ پا کر دی جائے، اور اس سے نکاح کرنا ہے تو یہ لازماً دل کے سچے ارادے اور سازگاری کی مخلصانہ خواہش کے ساتھ کیا جائے۔ اس سے مختلف کوئی رویہ اختیار کرنا کسی بندۂ مومن کے لیے اس معاملے میں جائز نہیں ہے۔

ہمارے فقہا ان شرائط پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ دوسرے شوہر سے طلاق لازماً مباشرت کے بعد ہونی چاہیے، اس کے بغیر وہ عورت کو پہلے شوہر کے لیے جائز نہیں سمجھتے۔ اس رائے کے حق میں جو دلائل ان کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں، ان میں سے زیادہ اہم یہ تین ہیں:

---

۳۲ ابن ماجہ، رقم ۱۹۳۶۔

اول یہ کہ آیت میں فعل 'تنکح' استعمال ہوا ہے۔اس میں نکاح کی نسبت عورت کی طرف کی گئی ہے،لیکن نکاح چونکہ عورت نہیں، بلکہ مرد کرتا ہے،اس لیے 'تنکح' لازماً یہاں مباشرت کے معنی میں ہوگا۔

دوم یہ کہ 'تنکح' کے بعد 'زوجاً غیرہ' کے الفاظ آئے ہیں۔ان میں 'زوجاً' کا لفظ خود بتا رہا ہے کہ نکاح تو ہو چکا، اس لیے ضروری ہے کہ 'تنکح' کو اب مباشرت کرنے ہی کے معنی میں لیا جائے۔

سوم یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے ایک عورت کو پہلے شوہر کی طرف مراجعت سے یہ کہہ کر روک دیا کہ دوسرے شوہر سے مباشرت کے بغیر وہ اس کے لیے جائز نہیں ہو سکتی۔

پہلی اور دوسری دلیل کا نہایت واضح جواب خود قرآن نے دے دیا ہے۔آیۂ زیر بحث کے صرف ایک آیت بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ ، فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ ۔ (البقرہ۲:۲۳۲)

''اور جب تم نے اپنی عورتوں کو طلاق دے دی اور وہ اپنی عدت کو بھی پہنچ گئیں تو اب اس میں مانع نہ ہو کہ وہ اپنے ہونے والے شوہروں سے نکاح کر لیں۔''

اس میں دیکھ لیجیے، نکاح کی نسبت بھی عورتوں کی طرف ہے اور اس کے بعد 'ازواجھن' بھی بالکل 'زوجاً غیرہ' کے طریقے پر آیا ہے، لیکن صاف واضح ہے کہ 'ان ینکحن' کے معنی یہاں عقد نکاح ہی کے ہیں۔اسے مباشرت کے معنی میں کسی طرح نہیں لیا جا سکتا۔

پھر یہ بات بھی نہایت عجیب ہے کہ نکاح کی نسبت عورتوں کی طرف نہیں ہو سکتی۔اس پر یہ پوچھنے کی جسارت کی جا سکتی ہے کہ نکاح کی نسبت اگر ان کی طرف نہیں ہو سکتی تو فعل مباشرت کی نسبت کیا ہو سکتی ہے؟ اس طریقے سے دیکھا جائے تو یہ بھی عورت نہیں، بلکہ مرد ہی کرتا ہے۔

رہی تیسری دلیل تو یہ درحقیقت ایک روایت کا مدعا نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔امام بخاری نے اسے جس طرح نقل کیا ہے، اسے دیکھنے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ عورت نے نکاح کیا ہی اس مقصد سے تھا کہ وہ پہلے شوہر کے لیے حلال ہو جائے۔چنانچہ طلاق لینے کے لیے اس نے جب غلط بیانی کر کے دوسرے شوہر کو زن وشو کا تعلق قائم کرنے سے قاصر قرار دیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر سرزنش کے لیے اسے یہ کہہ کر پہلے شوہر کے پاس جانے سے روک دیا کہ اب تم اس دوسرے شوہر سے لذت اندوز ہونے کے بعد ہی اس کے پاس جا سکتی ہو۔یہ بیان شرط نہیں، بلکہ تعلیق بالمحال کا اسلوب ہے۔ لہٰذا یہ روایت اگر کسی چیز کا ثبوت ہے تو حلالہ کی ممانعت کا ثبوت ہے، اس میں فقہا کے موقف کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے۔

روایت یہ ہے:

''عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ رفاعہ نے اپنی بیوی کو طلاق دی تو اس کے ساتھ عبدالرحمٰن بن زبیر قرظی نے نکاح کر لیا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سیدہ عائشہ بتاتی ہیں کہ وہ سبز دوپٹا اوڑھے ہوئے ان کے پاس آئی اور ان سے شوہر کی شکایت کی اور اپنے جسم کے نیل دکھائے۔ عورتیں ایک دوسری کی مدد کرتی ہی ہیں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو سیدہ نے عرض کیا: میں نے مسلمان عورتوں کے سوا کسی کے ساتھ اس طرح کا معاملہ نہیں دیکھا۔ اس کی جلد تو اس کے دوپٹے سے بھی زیادہ سبز ہو رہی ہے۔ عکرمہ کا بیان ہے کہ اس کے شوہر کو جب معلوم ہوا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت لے کر گئی ہے تو وہ بھی دوسری بیوی سے اپنے دو بیٹوں کو ساتھ لے کر حاضر ہو گیا۔ شوہر کو دیکھ کر اس نے دوپٹے کا سرا ہاتھ میں پکڑ کر لٹکایا اور کہا: مجھے اس سے یہی شکایت ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے، وہ میرے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس پر عبدالرحمٰن نے عرض کیا: خدا کی قسم، یا رسول اللہ، میں تو اس کے ساتھ وہی کرتا ہوں جو دباغت دینے والا چمڑے کے ساتھ کرتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ نافرمان ہے اور رفاعہ کے پاس واپس جانا چاہتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنا تو فرمایا: یہ بات ہے تو تم رفاعہ کے لیے ہرگز حلال نہیں ہو، جب تک عبدالرحمٰن تم سے لذت اندوز نہ ہو لے۔ پھر آپ نے عبدالرحمٰن کے بیٹوں کو دیکھ کر پوچھا: یہ تمھارے بیٹے ہیں؟ اس نے اثبات میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا: تم اس طرح کے جھوٹ بولتی ہو۔ بخدا، یہ تو عبدالرحمٰن کے ساتھ اس سے بھی زیادہ ملتے ہیں، جتنا کوئی کوا دوسرے سے ملتا ہوا ہوتا ہے۔'' (بخاری، رقم ۵۸۲۵)

۵۔ شوہر طلاق دے یا رجوع کرے، دونوں ہی صورتوں میں فرمایا ہے کہ اپنے اس فیصلے پر وہ دو ثقہ مسلمانوں کو گواہ بنا لے اور گواہوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اللہ کے لیے اپنی اس گواہی پر قائم رہیں۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ فریقین میں سے کوئی بعد میں کسی واقعے کا انکار نہ کرے اور اگر کوئی نزاع پیدا ہو تو اس کا فیصلہ آسانی کے ساتھ ہو جائے۔ مزید یہ کہ اس معاملے میں کسی قسم کے شکوک و شبہات پیدا نہ ہوں اور لوگوں کے لیے ہر چیز بالکل واضح اور متعین رہے۔

www.javedahmadghamidi.org

یہ طلاق کا صحیح طریقہ ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے مطابق اپنی بیوی کو علیحدہ کرتا یا علیحدگی کا فیصلہ کر لینے کے بعد اس کی طرف مراجعت کرتا ہے تو اس کے یہ فیصلے شرعاً نافذ ہو جائیں گے، لیکن کسی پہلو سے اس کی خلاف ورزی کر کے اگر طلاق دی جاتی ہے تو یہ پھر ایک قضیہ ہے جس کا فیصلہ عدالت کرے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس طرح کے جو مقدمات پیش ہوئے، ان میں دو نہایت اہم ہیں۔

پہلا مقدمہ عبداللہ بن عمر کا ہے۔ انھوں نے ایام حیض میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا۔ آپ اسے سن کر سخت ناراض ہوئے اور فرمایا: اسے حکم دو کہ رجوع کرے، پھر اسے اپنی زوجیت میں روکے رکھے، یہاں تک کہ وہ پاک ہو، پھر حیض آئے، پھر پاک ہو۔ اس کے بعد چاہے تو روک لے اور چاہے تو ملاقات سے پہلے طلاق دے دے۔ اس لیے کہ یہی اس عدت کی ابتدا ہے جس کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو طلاق دینے کی ہدایت فرمائی ہے۔[۳۳]

دوسرا مقدمہ رکانہ بن عبد یزید کا ہے۔ روایتوں کو جمع کرنے سے واقعے کی جو صورت سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ انھوں

۳۳۔ بخاری، رقم ۵۲۵۱۔ ابوداؤد، رقم ۲۱۸۲۔

نے اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دے دیں۔ پھر نادم ہوئے اور اپنا معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے پوچھا: طلاق کس طرح دی ہے؟ انھوں نے عرض کیا: ایک ہی وقت میں بیوی کو تین طلاق دے بیٹھا ہوں۔ آپ نے فرمایا: ارادہ کیا تھا؟ انھوں نے عرض کیا کہ ارادہ تو ایک ہی طلاق دینے کا تھا۔ آپ نے قسم دے کر پوچھا اور انھوں نے قسم کھالی تو آپ نے فرمایا: یہ بات ہے تو رجوع کرلو۔ یہ ایک ہی طلاق ہوئی ہے۔ انھوں نے عرض کیا: لیکن میں نے تو، یارسول اللہ، تین طلاق کہا تھا۔ آپ نے فرمایا: میں جانتا ہوں، تم رجوع کرلو، یہ طلاق دینے کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کے لحاظ سے طلاق دو۔[۳۴]

ان دونوں مقدمات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ جن اساسات پر مبنی ہے، وہ یہ ہیں:

قانون کی خلاف ورزی ہو جائے اور اس کی تلافی ممکن ہو تو قانون کے احترام کا تقاضا ہے کہ خلاف ورزی کرنے والے کو تلافی کا حکم دیا جائے۔

قائل کو اپنے منشا کی وضاحت کا حق ہے۔ وہ اگر یہ کہتا ہے کہ فلاں بات مجھ سے بلا ارادہ یا ارادہ و اختیار کے کسی وجہ سے سلب ہو جانے کے باعث صادر ہوئی ہے تو اس کی یہ وضاحت تسلیم کی جا سکتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی اسی اصل سے متعلق ہے کہ 'لا طلاق و لاعتاق فی غلاق'[۳۵] (غصے سے مغلوب ہو کر دی گئی طلاق موثر ہوتی ہے، نہ غلام کی آزادی کا فیصلہ)۔

تین طلاق کے الفاظ بیان عدد کے لیے بھی بولے جا سکتے ہیں اور فیصلے کی سختی، اتمام اور قطعیت ظاہر کرنے کے لیے بھی۔ یہ دونوں احتمالات چونکہ زبان و بیان کی رو سے بالکل یکساں ہیں، اس لیے قائل کی وضاحت اس معاملے میں بھی قابل قبول ہونی چاہیے۔

تاہم اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ قرائن اس کے خلاف بھی ہوں تو اس طرح کی وضاحت ماننا ضروری ہے۔ عدالت کو یہ حق یقیناً حاصل ہے کہ وہ اگر مطمئن نہیں ہو سکی تو اسے ماننے سے انکار کر دے۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں معلوم ہے کہ انھوں نے جب یہ دیکھا کہ لوگ پہلے کی طرح محتاط نہیں رہے تو اعلان کر دیا کہ اب کسی کا بیان بھی اس معاملے میں تسلیم نہ ہوگا اور تین طلاق کو تین طلاق ہی مان کر نافذ کر دیا جائے گا۔[۳۶]

[باقی]

۳۴؎ ابوداؤد، رقم ۲۱۹۶، ۲۲۰۶۔ ابن ماجہ، رقم ۲۰۵۱۔ ترمذی، رقم ۱۱۷۷۔ احمد بن حنبل، رقم ۲۳۸۳۔

۳۵؎ ابوداؤد، رقم ۲۱۹۳۔

۳۶؎ مسلم، رقم ۲۶۸۹۔

منظور الحسن

قومی تعمیر میں مذہبی قیادت کا کردار

(۲)

[اس موضوع پر تمہیدی مضمون مئی کے ''اشراق'' میں شائع ہو چکا ہے۔اس سلسلے کے باقی مضامین ان صفحات میں ان شاء اللہ سلسلہ وار شائع ہوتے رہیں گے۔نائب مدیر]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سید احمد شہید اور ان کی تحریک جہاد

سوانح

سید احمد ۲۹ نومبر ۱۷۸۶ کو رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ چار سال کی عمر میں مکتب میں داخل ہوئے۔ تعلیم کی طرف خاص رغبت محسوس نہ ہوئی۔ سپاہیانہ کھیلوں سے زیادہ دلچسپی رہی۔ بلوغ کو پہنچے تو خدمت خلق کا میلان ہوا۔ ساتھ ساتھ عبادت کا ذوق بڑھا اور تہجد کی نماز معمول بن گئی۔ ۱۷، ۱۸ سال کی عمر میں تحصیل معاش کے لیے لکھنؤ گئے۔ وہاں چند مہینے گزارے اور پھر حضرت شاہ ولی اللہ کے صاحب زادے شاہ عبدالعزیز صاحب سے ملاقات کی غرض سے دہلی روانہ ہو گئے۔ شاہ صاحب نے انھیں تعلیم و تربیت کی غرض سے اپنے بھائی شاہ عبدالقادر کے سپرد کیا۔ یہاں سید صاحب نے نصاب تعلیم تو مکمل نہیں کیا، مگر دینی علوم سے ضروری واقفیت بہم پہنچا لی۔ چار پانچ سال دہلی میں گزار کر واپس رائے بریلی پہنچے۔ چند برس بعد نواب امیر احمد خان کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ یہاں انھوں نے سپاہیوں میں دعوت و تبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ امیر خان انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا چاہتے تھے۔ جب امیر خان انگریزوں کی بڑھتی ہوئی قوت کا مقابلہ نہ کر سکے اور ان کے ساتھ مصالحت

اور ماتحتی کا رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تو سید احمد نے انھیں مصالحت سے روکنے اور برسر جنگ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر وہ آمادہ نہیں ہوئے۔ چنانچہ کم وبیش ۶ برس امیر خان سے وابستہ رہنے کے بعد سید صاحب علیحدہ ہو گئے اور دوبارہ شاہ عبدالعزیز کے پاس دہلی چلے گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۳۳ سال تھی۔ شاہ عبدالقادر وفات پا چکے تھے۔ سید صاحب انھی کی مسجد میں مقیم ہوئے اور سلسلۂ بیعت شروع کیا۔ جب مولانا عبدالحی اور شاہ اسماعیل جیسے علما دائرۂ بیعت میں داخل ہوئے تو لوگوں نے کثرت کے ساتھ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنا شروع کر دی۔ کچھ عرصہ بعد سید احمد نے ہندوستان کے متعدد علاقوں کا دورہ کیا۔ ان موقعوں پر بے شمار لوگ نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس دوران میں مولانا عبدالحی اور شاہ اسماعیل ان کے ہمراہ رہے۔ پھر وہ اپنے رفقا کے ہمراہ ایک بڑے قافلے کی صورت میں حج کے لیے روانہ ہوئے۔ حج کے دوران میں عقبہ کے مقام پر اپنے رفقا سے جہاد کی بیعت لی۔ واپس آ کر بریلی میں قیام کیا اور لوگوں کی حربی تربیت میں مصروف ہو گئے۔ اس زمانے میں انھوں نے ہندوستان کے علما اور اہل سیادت کو خطوط لکھ کر جہاد کے لیے ابھارا۔

کچھ سرفروشوں کی جمعیت تیار ہو جانے کے بعد انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کی حمیت میں مسلح جدوجہد شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں وہ انگریزوں سے برسر پیکار ہونا چاہتے تھے، مگر حالات اور بعض مصالح کے پیش نظر انھوں نے پنجاب میں قائم رنجیت سنگھ کی حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد کا عزم کیا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے پشاور کے نواحی علاقوں کو اپنا مستقر بنانے کا فیصلہ کیا۔ یہ علاقے لاہور کی سکھ حکومت کے باج گزار تھے۔ سید صاحب چند سو سرفروشوں کو لے کر نکلے اور سال بھر سفر کرتے ہوئے مقررہ علاقے میں پہنچے۔ بعض مقامی سرداروں کی حمایت سے اپنی امارت قائم کی اور سکھوں کے ساتھ جنگوں کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ سلسلہ زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا اور ۶ مئی ۱۸۳۱ کو وہ بالاکوٹ کے مقام پر اپنے بیشتر ساتھیوں سمیت شہید ہو گئے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

افکار

سید احمد شہید جہاد وقتال کے ذریعے سے ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کو دوبارہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے جو نقطہ ہائے نظر قائم کیے، وہ زیادہ تر ان کے خطوط اور خطبات سے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ ان کی بنا پر یہاں چند بنیادی نکات بیان کیے جا رہے ہیں۔

دین کی اشاعت میں اصل کردار جہاد کا ہے

سید احمد شہید کا تصور یہ تھا کہ اسلام کی اشاعت اصلاً جہاد ہی کی بدولت ہوئی ہے۔ وہ اکثر جسم پر ہتھیار سجا کر نکلتے اور اپنے اہل بیعت کو بھی اس کی ترغیب دیتے۔ ایک موقع پر رفقا کے ہمراہ ہتھیار لگا کر نکلے۔ کسی نے کہا کہ یہ تلوار یا بندوق وغیرہ

باندھنا آپ کے شایان شان نہیں ہے، یہ جہالت کے انداز ہیں اور آپ کے آبا کے طرز عمل کے خلاف ہیں۔ یہ سن ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ کہنے لگے:

''اس بات کا آپ کو کیا جواب دوں؟ اگر سمجھیے تو یہی کافی ہے کہ یہ وہ اسباب خیر و برکت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کو عنایت فرمائے تھے تاکہ کفار و مشرکین سے جہاد کریں اور خصوصاً ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سامان سے تمام کفار و اشرار کو زیر کر کے جہان میں دین حق کو روشنی بخشی۔ اگر یہ سامان نہ ہوتا، تو تم نہ ہوتے اور اگر ہوتے تو خدا جانے کس دین و ملت میں ہوتے۔'' (وزیر الدولہ، وقائع احمدی ۳۰۰)

جہاد تمام عبادات سے افضل ہے

سید صاحب کے نزدیک جہاد تمام عبادات سے برتر ہے۔ آغاز کار میں انھوں نے لوگوں کو قیام و سجود کی طرف زیادہ راغب کیا اور اس ضمن میں تصوف کے طریق بھی اختیار کیے، مگر بہت جلد اس پر جہاد کی تلقین و تربیت نے غلبہ پانا شروع کر دیا۔ اس تبدیلی پر بعض لوگوں نے شکایت کی تو سید صاحب نے فرمایا:

''ان دنوں اس (تصوف و سلوک) سے افضل کام ہم کو درپیش ہے۔ اسی میں ہمارا دل مشغول ہے۔ وہ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تیاری ہے۔ اگر کوئی تمام دن روزہ رکھے، تمام رات عبادت و ریاضت میں گزارے اور نوافل پڑھتے پڑھتے پیروں میں ورم آ جائے اور دوسرا شخص جہاد کی نیت سے ایک گھڑی میں بارود اڑائے تاکہ کفار کے مقابلے میں بندوق لگاتے آنکھ نہ جھپکے تو وہ عابد اس مجاہد کے رتبے کو ہرگز نہیں پہنچ سکتا اور (سلوک و تصوف کا) وہ کام اس وقت کا ہے، جب (جہاد کے) اس کام سے فارغ البال ہو۔'' (وزیر الدولہ، وقائع احمدی ۴۴۸)

غلبۂ دین وعدۂ الٰہی ہے

سید احمد نے اس نظریے کو پیش کیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ مسلمانوں کی نصرت اور دین اسلام کو غلبہ عطا فرمائے گا، اس لیے مسلمان اگر جدوجہد جاری رکھتے ہیں تو وہ لازماً کامیاب ہوں گے۔ اہل ہند کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''(ہماری جدوجہد کا) یہ سلسلہ انجام کو پہنچ کر رہے گا۔ و کان حقا علینا نصر المومنین (۳۰: ۴۷) اور اللہ کے وعدے کے مطابق یہ دین متین تمام ادیان پر غالب ہو کر رہے گا۔'' (ابوالحسن علی ندوی، سید احمد شہید ۱/ ۴۷۷)

مسلمانوں پر سرکش کفار کے ساتھ جنگ واجب ہے

سید احمد اس بات کا بھی اظہار کرتے تھے کہ کافروں اور سرکشوں سے ہر زمانے میں اور ہر مقام پر جنگ لازم ہے۔ مسلمانوں کی حالت اور اقامت جہاد کے حوالے سے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اگرچہ کفار اور سرکشوں سے ہر زمانے اور ہر مقام میں جنگ کرنا لازم ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ اس زمانے میں کہ

www.javedahmadghamidi.com / www.al-mawrid.org

اہل کفر وطغیان کی سرکشی حد سے گزر چکی ہے، مظلوموں کی آہ وفریاد کا غلغلہ بلند ہے، شعائر اسلام کی توہین ان کے ہاتھوں صاف نظر آ رہی ہے۔ اس بنا پر اب اقامت رکن دین، یعنی اہل شرک سے جہاد عامتہ مسلمین کے ذمے کہیں زیادہ مؤکد اور واجب ہو گیا ہے۔'' (ابوالحسن علی ندوی، سید احمد شہید ۱/۳۵۶)

اہل ہند کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''فقیر کی غرض یہ ہے کہ کام کا وقت سر پر آ گیا ہے اور معرکۂ کارزار درپیش ہے۔ ہر صاحبِ ایمان اور ہر مسلمان کو جسے اللہ نے اطاعت و انقیاد کی دولت عطا فرمائی ہے، اس وقت لازم ہے کہ جس طرح ممکن ہو، فقیر کے پاس پہنچ جائے اور مجاہدین اور مہاجرین کے زمرے میں شامل ہو جائے۔ جو شخص اس معرکے میں خود حاضر ہوگا، وہ سعادت سے مشرف ہوگا اور دوسروں سے سبقت لے جائے گا اور جو اس معاملے میں کاہلی اور سستی سے کام لے گا، وہ کل قیامت میں کف افسوس ملے گا۔'' (ابوالحسن علی ندوی، سید احمد شہید ۱/۴۷۷)

دین کا قیام سلطنت سے ہے

سید احمد کا سیاسی نظریہ یہ تھا کہ دین اور سلطنت میں کوئی تفریق نہیں، بلکہ دین کا قیام سلطنت کے قیام پر منحصر ہے۔ اپنے ایک خط میں انھوں نے اس نظریے کی وضاحت کی ہے:

''حقیقت میں مطابق مقولہ ''سلطنت و مذہب جڑواں ہیں'' اگرچہ یہ قول حجت شرعی نہیں، لیکن مدعا کے موافق ہے کہ دین کا قیام سلطنت سے ہے اور وہ دینی احکام جن کا تعلق سلطنت سے ہے، سلطنت کے نہ ہونے سے صاف ہاتھ سے نکل جاتے ہیں اور مسلمانوں کے کاموں کی خرابی اور سرکش کفار کے ہاتھوں ان کی ذلت ونکبت اور شریعت مقدسہ کے شعائر کی بے حرمتی اور مسلمانوں کی مساجد اور معابد کی تخریب جو ہوتی ہے، وہ بخوبی ظاہر ہے۔''

(ابوالحسن علی ندوی، سید احمد شہید ۱/۳۵۹)

تبلیغ جہاد وقتال کے بغیر نامکمل ہے

انھوں نے اس نظریے کا بھی اظہار کیا کہ دین کی دعوت وتبلیغ کے کسی مرحلے میں اگر جہاد نہ ہو تو اس کار خیر کی تکمیل ہی نہیں ہوتی۔ ہندوستانی علما کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''چونکہ زبانی دعوت وتبلیغ شمشیر وسناں سے جہاد کے بغیر مکمل نہیں ہوتی، اس لیے رہنماؤں کے پیشوا اور مبلغوں کے سردار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخر میں کفار سے جنگ کرنے کے لیے مامور ہوئے اور دینی شعائر کی عزت اور شریعت کی سربلندی وترقی اسی رکن جہاد کی اقامت کی وجہ سے ظہور پزیر ہوئی۔'' (ابوالحسن علی ندوی، سید احمد شہید ۱/۳۶۱)

جہاد کے لیے عسکری مساوات ضروری نہیں ہے

جنگی کارروائیوں کے دوران میں ایک موقع پر رنجیت سنگھ کی فوج کے سالار ونٹورا نے سید احمد شہید سے سفارتی ملاقات

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کی خواہش ظاہر کی۔ سید صاحب نے مولوی خیر الدین صاحب کو اپنے سفیر کے طور پر روانہ کیا۔ اس ملاقات میں جو گفتگو ہوئی اس سے سید صاحب کے افکار کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ ہم یہاں اس کا خلاصہ بیان کر دیتے ہیں۔ وینٹورا نے جو فارسی زبان پر عبور رکھتا تھا، مولوی صاحب سے پوچھا کہ آپ کے خلیفہ نہایت بے سروسامانی کی حالت میں ایک ایسی ہستی سے کیوں برسرِ پیکار ہیں جو خزانوں، دفتروں، فوج اور لشکروں کی مالک ہے؟ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ اسلام میں پانچ احکام فرض کا درجہ رکھتے ہیں: نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد۔ جہاد کا شرعی مفہوم اعلاے کلمۃ اللہ کی جدوجہد ہے۔ سید صاحب نے جہاد کا فریضہ ادا کرنے کا تہیہ کیا ہے۔ ادائیگیِ جہاد کی دو شرطیں ہیں: ایک یہ کہ مجاہدین کی جماعت کا امام ہو جس کے تحت شرعی طریقے سے جہاد کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ کوئی دارالامن ہو جہاں سے اس فریضے کا آغاز کیا جا سکے۔ ہندوستان میں سید صاحب کی صورت میں امام تو میسر تھا، مگر دارالامن میسر نہیں تھا اور سرحد میں قبائل یوسف زئی کو دارالامن تو میسر تھا، مگر ان کا کوئی شرعی امام نہ تھا۔ چنانچہ سید صاحب نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا۔ یہاں کے لوگوں نے ان کی خلافت و امامت پر بیعت کی۔ اب ہمارے لیے ان کی حیثیت امیر المومنین کی ہے۔ دین میں جماعت مجاہدین کے امام کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ اس کی عسکری صلاحیت دشمن کے برابر ہو۔ البتہ دین کی ترقی شرط لازم ہے۔

وینٹورا نے کہا کہ آپ کی باتیں ٹھیک ہیں، مگر یہ چیز ناقابلِ فہم ہے کہ آپ کے خلیفہ کے پاس نہ افواج ہیں، نہ توپ خانہ، نہ سرمایہ، نہ ملک، لیکن اس کے باوجود ان کے اتنے بڑے عزائم ہیں۔

مولوی صاحب نے کہا کہ اہل دنیا کو تو فوج، توپ اور خزانوں پر اعتقاد ہوتا ہے اور ہم کو اللہ کی قدرت پر بھروسا ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ 'کم من فئة قلیلة غلبت فئة کثیرة باذن اللّٰه'۔ تاریخ شاہد ہے کہ کسی پیغمبر کے پاس بھی خزانہ، توپ اور فوج نہ تھی۔ انھوں نے غریب پیرووں کے ساتھ بڑے بڑے زبردستوں کو خاک میں ملا دیا۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

اہداف

ان افکار و نظریات کی بنیاد پر جو اہداف سید احمد کے پیشِ نظر رہے، وہ یہ ہیں:

کفر و ضلالت سے جنگ اور اعلاے کلمۃ اللہ

سید احمد نے اپنی تحریک جہاد کا مقصد کفر و ضلالت کے خلاف جنگ طے کیا۔ سرحد کے ایک سردار کو ارسال کیے جانے والے خط میں انھوں نے لکھا ہے:

''اس تمام جہد و جد سے فقیر کا مقصود صرف یہ ہے کہ اہل کفر و ضلالت سے جنگ کرنے کے بارے میں جو احکام وارد ہوئے ہیں اور فرمان خداوندی: 'جاھدوا باموالکم و انفسکم' (اپنے مال و جان کے ساتھ جہاد کرو) کی تعمیل کی

صورت پیدا ہو۔فرماں بردار بندے کے لیے اپنے مالک کے حکم کی تعمیل کے بغیر چارہ نہیں۔''

(ابوالحسن علی ندوی، سید احمد شہید ۱/ ۳۵۳)

شاہ سلیمان کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اس تمام معرکہ آرائی اور جنگ آزمائی کا مقصود اعلاے کلمۃ اللہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت زندہ ہو اور مسلمانوں کا ایک ملک کفار ومشرکین کے قبضے سے نکل آئے۔اس کے سوا کوئی مقصود نہیں۔''

(ابوالحسن علی ندوی، سید احمد شہید ۱/ ۳۵۹)

اسی طرح امراے ہندوستان کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

''کفار اور دشمنوں کے ساتھ جو جذبۂ جہاد فقیر کے دل میں موجزن ہے، اس میں رضاے الٰہی اور اعلاے کلمۃ اللہ کے مقصد کے سوا عزت وجاہ ومال ودولت، شہرت ونا موری، امارت، سلطنت، برادران ومعاصرین پر فضیلت وبزرگی یا کسی اور چیز کا فلسفہ خیال ہرگز دل میں نہیں ہے۔'' (ابوالحسن علی ندوی، سید احمد شہید ۱/ ۳۵۶)

رضاے الٰہی کا حصول

انھوں نے واضح کیا کہ ان کی ساری جدوجہد متاع دنیا اور حکومت وسلطنت کے لیے نہیں ہے، بلکہ وہ یہ سب کچھ سرتا سر رضاے الٰہی کے لیے کر رہے ہیں۔سرحد کے علما اور روسا کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''ہم محض رضاے الٰہی کے آرزومند ہیں۔ ہم اپنی آنکھوں اور کانوں کو غیر اللہ کی طرف سے بند کر چکے ہیں اور دنیا و مافیہا سے ہاتھ اٹھا چکے ہیں۔ہم نے محض اللہ کے لیے علم جہاد بلند کیا ہے۔ہم مال ومنال، جاہ وجلال، امارت وریاست، حکومت وسیاست کی طلب وآرزو سے آگے نکل گئے ہیں۔خدا کے سوا ہمارا کوئی مطلوب نہیں۔''

(ابوالحسن علی ندوی، سید احمد شہید ۱/ ۳۵۵)

مزید لکھتے ہیں:

''جب تک ہمارے جسم میں جان ہے اور ہمارے سر جسموں کے ساتھ ہیں، ہم بصد حیلہ وفن اسی سودے میں لگے ہوئے ہیں۔خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم اپنے مالک کی اطاعت میں مشغول ہیں اور محض رضائے الٰہی کے آرزومند۔''

(ابوالحسن علی ندوی، سید احمد شہید ۱/ ۳۶۱)

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا قیام

ہندوستان میں ان کی مساعی کا عملی ہدف انگریزوں کو نکالنا اور مسلمانوں کی حکومت کو ازسر نو قائم کر کے نفاذ شریعت کی راہ ہموار کرنا تھا۔ ہند میں جہاد کی ضرورت کے حوالے سے وزیر گوالیار کو لکھتے ہیں:

''جناب کو خوب معلوم ہے کہ یہ پردیسی سمندر پار کے رہنے والے، دنیا جہان کے تاجدار اور یہ سودا بیچنے والے سلطنت

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کے مالک بن گئے ہیں۔ بڑے بڑے اہل حکومت اوران کی عزت وحرمت کوانھوں نے خاک میں ملا دیا ہے۔ جوحکومت و سیاست کے مرد میدان تھے، وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔اس لیے مجبوراً چند غریب و بے سروسامان کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہوگئے اور محض اللہ کے دین کی خدمت کے لیے اپنے گھروں سے نکل آئے۔''

(ابوالحسن علی ندوی،سید احمد شہید۱/۳۵۸)

شہزادہ کامران کے نام ایک خط میں اپنے جنگی اہداف کوان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''اس ملک (سرحد) کومشرکین کی نجاستوں سے پاک کرنے اور منافقین کی گندگی سے صاف کرنے کے بعد حکومت و سلطنت کا استحقاق اور ریاست اور انتظام سلطنت کی استعداد رکھنے والوں کے حوالے کر دیا جائے گا،لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ احسان خداوندی کا شکر بجالائیں گے اور ہمیشہ اور ہر حال میں جہاد کو قائم رکھیں گے اور کبھی اس کوموقوف نہیں کریں گے اور انصاف اور مقدمات کے فیصلے میں شرع شریف کے قوانین سے بال بھر بھی تجاوز وانحراف نہیں کریں گے اور ظلم وفسق سے کلیتہً اجتناب کریں گے۔اس کے بعد میں اپنے مجاہدین کے ساتھ ہندوستان کا رخ کروں گا تاکہ اس کوشرک وکفر سے پاک کیا جائے ،اس لیے کہ میرا مقصود اصلی ہندوستان پر جہاد ہے، نہ کہ ملک خراساں (سرحد وافغانستان) میں سکونت اختیار کرنا۔'' (ابوالحسن علی ندوی،سید احمد شہید۱/۳۶۲)

مسلمانوں کی حالت زاراور اصلاح احوال کے لیے لائحۂ عمل کوایک تمثیل میں بیان کرتے ہیں:

''جب کسی کے مکان کی کوئی دیوار گر جاتی ہے، سارے گھر والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ مرد،عورت، بچے سب اس کی درستی کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ ہر ایک اپنے مقدور بھر اس کی تیاری میں سرگرم ہوتا ہے۔کوئی اینٹ لاتا ہے،کوئی مٹی لاتا ہے اور چھت کی تیاری میں منہمک ہو جاتا ہے۔ جب سارے گھر والے دن رات لگ کر اور مشقت اور تکلیف برداشت کر کے ایک زمانے کے بعد اپنے گھر کو درست اور آباد کر لیتے ہیں تو پھر مدتوں تک اس میں آرام پاتے ہیں۔

اسی طرح اس زمانے میں مسلمانوں کے دین کی عمارت منہدم ہوگئی ہے۔ کفار رہزنوں کی طرح مسلمانوں کے گھر کے مال واسباب کولوٹ رہے ہیں اور دست تعدی دراز کر رہے ہیں، اس لیے کہ اس گھر کا کوئی نگہبان اور پاسبان نہیں رہا۔اب سونے والوں کوخوابِ غفلت سے بیدار ہونا چاہیے اور اپنے ویران مکان کی پاسبانی کر کے اور اس کا سامان مہیا کر کے اس کو آباد کرنا چاہیے اوران رہزنوں اور چوروں کو گرفتار کر کے ان کوان کے اعمال کی سزا دینی چاہیے اور ان سے اپنی خدمت لینی چاہیے۔ مکان کے آباد ہو جانے کے بعد اطمینان کے ساتھ وہ مکان میں آرام کر سکتے ہیں۔''

(ابوالحسن علی ندوی،سید احمد شہید۲/۳۹۷)

اقدامات

سید احمد نے اپنے افکار ونظریات کی ترویج اور اہداف و مقاصد کے حصول کے لیے جو اقدامات کیے انھیں ہم واقعاتی

ترتیب سے یہاں بیان کر دیتے ہیں۔

رنجیت سنگھ کی حکومت کے خلاف جدوجہد کا فیصلہ

سید احمد کا اصل مقصد اگرچہ پورے ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت قائم کرنا تھا اور اس بنا پر ان کے اصل حریف انگریز تھے، مگر انھوں نے جنگی جدوجہد کا آغاز پنجاب میں رنجیت سنگھ کی حکومت کے خلاف کارروائی سے کیا۔ اس فیصلے کے کئی اسباب تھے۔

ایک سبب یہ تھا کہ سکھ حکومت نے مسلمانوں پر ظلم کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ مسلمانوں کی سیاست، معیشت، معاشرت تباہ ہو رہی تھی۔ معاملہ اس انتہا تک پہنچ گیا تھا کہ ان کی مساجد بھی سکھوں کی تاخت سے محفوظ نہ تھیں اور وہ آزادی کے ساتھ ان میں عبادت کرنے سے قاصر تھے۔ اس صورت حال کو ایک انگریز مصنف نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''واقعہ یہ ہے کہ پنجاب بھر میں ایک بھی ایسے مسلمان خاندان کی مثال نہیں ملتی، جس کو عزت واقتدار حاصل ہو۔ یہ صورت حال اس نفرت کا نتیجہ ہے جو گرو گوبند سنگھ کے پیرووں کو اپنے قدیم حریفوں کی نسل سے چلی آ رہی ہے، جنھوں نے ان پر مظالم کیے تھے۔ اس کا ثبوت کہ یہ گہری عداوت اب بھی زائل نہیں ہوئی ہے، اس سلوک سے ملتا ہے جو ان بدقسمت مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، جو ابھی تک سکھوں کی عمل داری میں رہتے ہیں، جو اگرچہ کثیر التعداد ہیں، لیکن سب غریب نظر آتے ہیں اور ایک مظلوم اور ذلیل قوم کے فرد معلوم ہوتے ہیں۔ وہ زمین جوتتے ہیں، ان سے قلی گیری، بوجھ ڈھونے اور محنت ومشقت کے کام لیے جاتے ہیں۔ ان کو گائے کا گوشت کھانے کی اجازت نہیں، نماز نہیں پڑھ سکتے، شاذ ونادر مسجد میں جمع ہو کر نماز پڑھ سکتے ہیں۔ مسجدوں میں بھی تھوڑی مسجدیں تباہی سے بچی ہیں۔''

(Lieut. Col. Malcolm, The Sketch of hte Sikhs 124-125)

ان حالات میں پنجاب کے مسلمان دینی واخلاقی پستی اور قومی بے اعتمادی کا شکار ہو گئے تھے۔ سید احمد کو اس صورت حال سے بہت رنج ہوا، چنانچہ انھوں نے پہلے اس چھوٹے مسئلے کو حل کرنے کا فیصلہ کیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ سیاسی اور عسکری مصالح کے پیش نظر اپنی جدوجہد ہندوستان کی شمال مغربی سرحد سے شروع کرنا چاہتے تھے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ پنجاب اسی سرحد سے ملحق تھا۔ مزید یہ کہ سرحد کا یہ علاقہ طاقت ور اور پرجوش افغانی قبائل کا مرکز تھا اور اس کے پیچھے ترکستان تک آزاد مسلمان ریاست کا ایک پورا سلسلہ موجود تھا۔ پھر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس علاقے میں ان کا ایک وسیع حلقۂ ارادت تھا۔ ان کے علاوہ ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ پشاور اور اس کے گردونواح کے علاقے رنجیت سنگھ کی حکومت لاہور کے باج گزار تھے۔ ہر سال سکھوں کا لشکر اس علاقے میں آتا اور رقم وصول کر کے جاتا۔ اس علاقے کے باشندے ظاہر ہے کہ اس سے ناخوش تھے۔

اس صورت حال میں سید احمد نے ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کا رخ کیا۔ ۱۷ جنوری ۱۸۲۶ کو رائے بریلی سے روانہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہوئے۔ گوالیار، ٹونک، اجمیر، عمر کوٹ، حیدر آباد (سندھ)، شال (کوئٹہ)، قندھار، غزنی اور کابل سے ہوتے ہوئے پشاور پہنچے۔ ۱۸ دسمبر ۱۸۲۶ کو نوشہرہ پہنچے اور وہیں قیام کیا۔ یہاں سے رنجیت سنگھ کو لاہور ایک خط بھجوایا جس کا مضمون یہ تھا:

''۱۔ یا تو اسلام قبول کر لو (اس وقت ہمارے بھائی اور ہمارے مساوی ہو جاؤ گے، لیکن اس میں کوئی جبر نہیں)۔

۲۔ یا ہماری اطاعت اختیار کر کے جزیہ دینا قبول کر لو۔ اس وقت ہم اپنے جان و مال کی طرح تمھارے جان و مال کی حفاظت کریں گے۔

۳۔ آخری بات یہ ہے کہ اگر تم کو دونوں باتوں میں سے کوئی بھی منظور نہیں تو لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ، مگر یاد رکھو کہ سارا یاغستان اور ملک ہندوستان ہمارے ساتھ ہے اور تم کو شراب کی محبت اتنی نہ ہوگی، جتنی ہم کو شہادت کی ہے۔''

(ابوالحسن علی ندوی، سیرت سید احمد شہید ۱/۴۵۶)

رنجیت سنگھ کی فوج کے خلاف مسلح کارروائیوں کا آغاز

رنجیت سنگھ کی طرف سے خط کا مثبت جواب نہ پا کر سید صاحب نے جنگ کا فیصلہ کیا اور اکوڑے خٹک میں مقیم سکھوں کے لشکر پر شب خون مارنے کے لیے تیار ہو گئے۔ سات ہزار فوج پر مشتمل رنجیت سنگھ کے اس لشکر کی قیادت بدھ سنگھ کر رہا تھا۔ اس وقت سید صاحب کے ساتھ موجود مجاہدین کی تعداد سات سو تھی۔ اس میں پانچ سو ہندوستان سے اور دو سو قندھار سے تعلق رکھتے تھے۔ دسمبر ۱۸۲۲ کی رات کے تین بجے مجاہدین نے لشکر پر حملہ کر دیا۔ کچھ لوگ خیموں کو گرانے لگے اور کچھ نے مال اسباب لوٹنا شروع کر دیا۔ اس معرکے میں چالیس کے قریب مسلمان شہید ہوئے اور سات سو سکھ مارے گئے۔ اس کے بعد سکھوں کے زیر تسلط حضرو کی بستی پر حملہ کیا اور سامان غنیمت حاصل کیا۔ ان واقعات کے بعد بدھ سنگھ نے سید صاحب کو یہ خط لکھا:

''شرافت، منزلت، سیادت، مرتبت، فضیلت پناہ، عبادت انتباہ، زبدۃ الفضلاء العظام، یگانۂ بلا اشتباہ، سید احمد صاحب سلمہٗ۔ واضح ہو کہ اتنی مسافت طے کرنے کے بعد اور اتنے دور دراز ملک سے آ کر آپ نے لڑائی کی طرح ڈالی اور لباسِ شہادت کو اپنے اوپر آراستہ کیا ہے، تو لازم تھا کہ جنگ و مقابلہ میدان میں نکل کر ہو۔ طمع نفسانی سے شہرِ حضرو کے غربا اور بیوپاریوں پر شبخون اور چھاپہ مارنا ذلت اور ہمیشہ کی بدنامی کی بات ہے۔ اسی کے ساتھ آپ کے ہمراہی جس طرح شیشے کو پتھر سے مارا جائے، اسی طرح معدوم ہو گئے۔ اب بھی اگر آپ اصل سید اور بڑے سردار ہیں، تو باہر نکل کر صاف صاف مقابلہ کیجیے۔ چھپ کر لڑنے سے دنیا اور دین کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اور اگر فرار اختیار کریں گے، تو دونوں جہان کے نفع سے خالی ہاتھ جائیں گے۔'' (ابوالحسن علی ندوی، سید احمد شہید ۱/۴۶۹)

اس خط کے جواب میں سید صاحب نے لکھا:

''امیر المومنین سید احمد کی طرف سے سپہ سالار جنود و عساکر، مالک خزائن و دفاتر، جامع ریاست و سیاست، حادی امارت و ایالت، صاحب شمشیر و جنگ، عظمت نشان، سردار بدھ سنگھ کو (اللہ اس کو سیدھے راستے کی ہدایت دے اور اس پر توفیق کی

بارش کرے) واضح ہو کہ آپ کا گرامی نامہ، جو اظہارِ مراتب شجاعت وشہامت کے وعادی پر مشتمل ہے، پہنچا اور اس کے مضمون سے آ گاہی ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرا اس ہنگامہ آرائی اور معرکہ پیرائی سے جو مقصود ہے، آپ نے اس کو اچھی طرح نہیں سمجھا اور اسی لیے آپ نے اس طرح کا خط لکھا۔ اب کان لگا کر سنیے اور غور کر کے سمجھیے کہ اہل حکومت وریاست سے لڑائی جھگڑا چند اغراض سے ہوتا ہے۔ بعض آدمیوں کا مقصود مال وریاست کا حصول ہوتا ہے، بعض کو محض اپنی شجاعت اور دلیری دکھانی ہوتی ہے اور بعض آدمیوں کا مقصد شہادت کا مرتبہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اس سے میرا مقصد ہی دوسرا ہے، یعنی، فقط اپنے مولا کے حکم کی بجا آوری جو مالکِ مطلق اور بادشاہ برحق ہے۔ اس نے دین محمدی کی نصرت واعانت کے بارے میں جو حکم دیا ہے، محض اس کی تعمیل مقصود ہے۔ خداے عزوجل اس بات کا گواہ ہے کہ میرا اس ہنگامہ آرائی سے اس کے علاوہ کوئی دوسرا مقصود نہیں اور اس میں کوئی نفسانی غرض ہرگز شامل نہیں، بلکہ کسی نفسانی غرض کے حصول کی آرزو نہ کبھی زبان پر آتی ہے، نہ کبھی دل میں گزرتی ہے۔ دین محمدی کی نصرت میں جو کوشش بھی ممکن ہوگی، بجالاؤں گا اور جو تدبیر بھی مفید ہوگی، عمل میں لاؤں گا اور ان شاء اللہ زندگی کی آخری سانس تک اسی کوشش میں مشغول رہوں گا اور اپنی پوری عمر اسی کام میں صرف کر دوں گا۔ جب تک زندہ ہوں، اسی راستے پر چلتا رہوں گا اور جب تک دم میں دم ہے، اسی کا دم بھرتا رہوں گا۔ جب تک پاؤں ہیں، اس وقت تک یہی راستہ ہے اور جب تک سر ہے، اس وقت تک یہی سودا۔ خواہ مفلس ہوں، خواہ دولت مند، خواہ منصب سلطنت سے سرفراز ہوں، خواہ کسی کی رعیت بنوں، خواہ بزدلی کا الزام سہوں، خواہ شہادت سے سرخرو ہوں۔ ہاں، اگر میں دیکھوں کہ میرے مولیٰ کی خوشی اسی میں ہے کہ میدانِ جنگ میں تنہا سر بکف آؤں، تو خدا کی قسم کہ سو جان سے سینہ سپر ہوں گا اور لشکر کے نرغے میں بے کھٹکے گھس آؤں گا۔ مختصر یہ کہ مجھے نہ اپنی شجاعت کا اظہار مقصود ہے، نہ ریاست کا حصول۔ اس کی علامت یہ ہے کہ اگر سربرآوردہ حکام اور عالی مرتبت سرداروں میں سے کوئی شخص دین محمدی قبول کر لے تو میں اس کی مردانگی کا سو زبان سے اعتراف واظہار کروں گا اور ہزار جان سے اس کی سلطنت کی ترقی چاہوں گا اور اس کی حکومت کی ترقی کے لیے بے حد کوشش کروں گا۔ اس بات کا آپ فوراً امتحان کر سکتے ہیں۔ اگر اس کے خلاف ہو، تو مجھے الزام دیجیے۔ اگر آپ انصاف کی نظر سے دیکھیں، تو مجھے اس معاملے میں ہرگز قابل ملامت اور قابل الزام نہ پائیں گے، کیونکہ جب جناب اپنے حاکم کے احکام کی تعمیل میں، جو آپ جیسا ایک انسان، بلکہ آپ کی برادری کا ایک فرد ہے، کوئی عذر اور کوئی حیلہ نہیں کر سکتے، تو میں احکم الحاکمین کے حکم کی تعمیل میں، جو زمین وآسمان کے تمام افراد انسانی اور ساری کائنات کا خالق ہے، کیا عذر کر سکتا ہوں۔ (ابوالحسن علی ندوی، سید احمد شہید ۱/۴۶۹)

اس مراسلت کے بعد شیدو کے مقام بڑا معرکہ ہوا۔ پشاور کے سرداروں نے سید احمد سے بھرپور تعاون کا وعدہ کیا تھا، لیکن عین موقع پر وہ وعدے سے پھر گئے۔ اس معرکے میں مجاہدین کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

امامت وخلافت کی بیعت

حملوں کے موقعوں پر سید احمد نے یہ محسوس کیا کہ مقامی لوگ نظم وضبط کی پابندی نہیں کرتے تو انھوں نے لوگوں سے بیعت

امامت وخلافت لی اور اعلان کیا کہ حدود شرعیہ کا نفاذ ہوگا اور جمعے کے خطبے میں ان کا نام پڑھا جائے گا۔اس موقع پر انھوں نے ہند میں موجود اپنے رفقا کو ایک خط تحریر کیا۔ اس میں انھوں نے اپنے سفر کی داستان بیان کرنے کے بعد بیعت امامت کی ضرورت کو بیان کیا اور لوگوں کو جہاد کے لیے بلایا۔ لکھتے ہیں:

''مجاہدین کا لشکر ایک بے سری فوج اور عام بلوائیوں کی طرح تھا اور کوچ ومقام میں کہیں کوئی نظم نہیں تھا۔اس لیے مالِ غنیمت شرحِ شریف کے قانون کے مطابق تقسیم نہ ہو سکا۔اس بنا پر تمام مسلمانوں نے، جو موجود تھے، جن میں سادات، علما، مشائخ، امرا اور خواص وعوام تھے، بالاتفاق اس بات کو کہا کہ جہاد کا قیام اور کفر وفساد کا ازالہ امام کے تقرر کے بغیر مسنون اور شرعی طریقے پر انجام نہیں پا سکتا۔اس بنا پر ۱۲ جمادی الاخرہ ۱۲۴۲ھ کو ان سب نے اس فقیر کے ہاتھ پر بیعت امامت کی اور اس کی اطاعت کا عہد کیا۔ جمعے کے روز خطبہ بھی اس فقیر کے نام کا پڑھا گیا۔ان شا اللہ اس رکن رکین کے ادا کرنے کی برکت سے، جس پر دین کے اکثر احکام کا مدار ہے، فتح ونصرت ظاہر ہوگی''۔(ابوالحسن علی ندوی، سید احمد شہید ۱/ ۴۷۷)

اس موقع پر کئی مقامی سرداروں اور علماے کرام نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت امامت کی اور انھیں اپنا امیر تسلیم کر لیا۔ بیعت لینے کے بعد انھوں نے اعلان کر دیا کہ اب سب لوگوں کو شریعت کی پوری پابندی کرنا ہوگی۔

سکھ فوج کو سالیانہ دینے سے انکار اور معرکہ آرائی

پنجتار کے علاقے کو سید احمد نے اپنا مستقر بنا لیا تھا۔رنجیت سنگھ کی فوج کا یہ عام دستور تھا کہ وہ ہر سال دریائے اٹک کے مشرقی کنارے پر واقع ایک علاقے چھچھ میں آتی تھی اور سالیانہ وصول کر کے رخصت ہوتی تھی۔سید احمد کی آمد کے بعد قبائل نے سالیانہ دینے کا ارادترک کر دیا۔سید صاحب کی موجودگی میں جب سکھوں کا لشکر فرانسیسی سالار وینٹورا کی قیادت میں وصولی کے لیے آیا تو سوائے ایک سردار حادی خان کے باقی سرداروں نے (نعل بندی) سالیانہ دینے سے انکار کر دیا۔ وینٹورا نے سید احمد کو خط لکھا کہ یہ ملک رنجیت سنگھ کی عمل داری میں ہے۔سمہ کے رئیس ہمیشہ ہمیں نعل بندی دیتے رہے ہیں، مگر جب سے آپ آئے ہیں، یہ منحرف ہو گئے ہیں، آپ ہمیں اپنے ارادوں سے آگاہ کریں۔سید صاحب نے جواب دیا کہ یہ ملک سکھوں کا نہیں، بلکہ مسلمانوں کا ہے۔تمام ملک مشرق سے مغرب تک اللہ کے قبضے میں ہے، وہ جس کی تلوار کو زور دیتا ہے، وہ لے لیتا ہے۔کافروں سے جنگ کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اگر قوت وہمت دے تو ہم ملک کو کفر سے پاک کر دیں۔صورت حال کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے وینٹورا واپس چلا گیا۔اگلے ایک سال کے دوران میں سید احمد کے حلیفوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ وینٹورا دوبارہ پنجتار پر حملے کے ارادے سے آیا۔سید احمد کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے پنجتار سے پہلے درے میں دو پہاڑوں کے درمیان دیوار کی تعمیر شروع کرا دی۔ دیوار مکمل ہونے کے چند روز بعد سکھوں کا لشکر پنجتار میں پہنچا۔ سید احمد نے لوگوں سے موت کی بیعت لی۔ وینٹورا نے تھوڑی سی کوشش کی، مگر اسے محسوس ہوا کہ وہ مقابلہ نہ کر سکے گا، چنانچہ اس نے پسپائی اختیار کی۔اس پسپائی کی وجہ سے سید احمد کا علاقے پر رسوخ بڑھ گیا۔اس صورت حال میں رنجیت سنگھ نے اس

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

خیال سے کہ سید صاحب جس طرح کے درویش صفت آدمی ہیں، انھیں جلد نذرانہ مقرر کر کے گوشہ نشینی پر آمادہ کیا جا سکے گا، سید احمد کو مصالحت کا یہ پیغام بھیجا کہ دریائے اٹک کے پار کی جاگیر اور علاقے کا مالیہ بھی آپ ہی وصول کیا کریں اور ہم سے جنگ کا خیال ترک کر دیں۔ سید احمد نے جواب دیا کہ ہم اعلاے کلمۃ اللہ کے لیے آئے ہیں۔ اگر تو مسلمان ہو جائے تو ہم سارا علاقہ تمھارے حوالے کر دیں گے۔ گفت و شنید سے مسئلہ حل نہ ہو سکا تو وینٹورا نے پنجتار پر حملے کا ارادہ کیا۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنی فوج لے کر پنجتار کے قریب پہنچ گیا، مگر اس کی سپاہ میں خوف اور بددلی پھیل گئی اور اسے پسپائی اختیار کرنا پڑی۔

قوانین کا نفاذ اور قبائلی سرداروں کی بغاوت

یہ کہا جا سکتا ہے کہ پشاور اور گردونواح کے سرداروں کے مطیع ہونے سے اس علاقے پر سید صاحب کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ مگر درحقیقت پنجتار کے علاوہ باقی علاقوں کے سرداروں، خوانین اور ملاؤں نے دل سے سید احمد کی سیادت قبول نہیں کی تھی۔ تاہم، قیام حکومت کے بعد جب سید احمد نے شریعت کے بعض احکام کو سختی سے نافذ کیا اور ان کی صدیوں سے قائم روایات کو توڑا تو عام لوگ بھی متردد ہونا شروع ہو گئے۔ چنانچہ ان لوگوں نے ایک سازش کے تحت سید صاحب کے مقرر کردہ عاملوں اور قاضیوں کو یک بارگی قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ بیشتر جگہوں پر یہ منصوبہ کامیاب ہو گیا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ہجرت کا فیصلہ

اس سازش کی کامیابی کے بعد سید صاحب اس علاقے سے حد درجہ مایوس ہو گئے اور انھوں نے یہاں سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس موقع پر ان کے رفیق کار مولوی خیر الدین صاحب نے ان سے دو باتوں میں اختلاف کیا۔ ایک اختلاف یہ تھا کہ تنخواہ دار فوج بھرتی اور ملازمین کا تقرر کیے بغیر اس زمانے میں جہاد نہیں ہو سکتا۔ لاکھوں آدمیوں نے آپ کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کی تھی، مگر جہاد کے موقع پر ان کا نشان بھی نہیں ہے۔ دوسرا اختلاف یہ تھا کہ یہاں کے لوگ برتے ہوئے ہیں، ان سے معاملہ آسان ہے، کسی دوسری جگہ پر جائیں گے تو معلوم نہیں وہ لوگ آپ کو قبول بھی کریں۔ سید صاحب کی طرف سے پہلے اختلاف کا جواب یہ تھا کہ میں خلاف سنت طرز عمل اختیار نہیں کر سکتا، دوسرے اختلاف کا جواب یہ تھا کہ یہاں مخلص کم اور مفسد زیادہ ہیں۔ یہاں کے لوگوں سے مجھ کو ایسی نفرت محسوس ہوتی ہے جو آدمی کو اپنی قے سے ہوتی ہے۔

معرکۂ بالاکوٹ

ہجرت کر کے سید احمد اپنے لشکر کے ہمراہ سردار ناصر خان کے علاقے راج دواری میں مقیم ہوئے۔ یہاں انھوں نے مقامی سرداروں کے مابین اختلاف ختم کر کے انھیں سکھوں کے خلاف جہاد کے لیے آمادہ کیا۔ اس زمانے میں وادیِ کاغان کے علاقے میں خانہ جنگی کی صورت تھی۔ اس صورت حال سے سکھ فائدہ اٹھا رہے تھے۔ مظفر آباد کے سردار زبردست خان کو اس کے چچا زاد نے سکھوں کی مدد سے نکال کر اپنا قبضہ کر لیا تھا۔ گڑھی حبیب اللہ کے سردار حبیب اللہ خان کو سکھوں نے

نکال دیا تھا اور وہ بالاکوٹ کے درے میں پناہ گزین تھا۔بعض اور سردار بھی اسی صورت حال سے دوچار تھے۔ان سرداروں کی مدد کرکے فوجی قوت حاصل کرنے کا سب سے مناسب مقام بالاکوٹ تھا۔سید احمد نے اسی مقام کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے انھوں نے مولوی خیرالدین اور مولانا محمد اسماعیل کو کچھ مجاہدین کے ہمراہ بالاکوٹ روانہ کیا۔ان کے پیچھے سید صاحب بھی ساڑھے تین سو کا لشکر لے کر روانہ ہوئے اور بالاکوٹ سے پہلے بیچون میں قیام کیا۔مولانا محمد اسماعیل جب بالاکوٹ پہنچے تو ان کے پاس مظفر آباد کا جلاوطن سردار زبردست خان اور بعض دوسرے سردار آئے اور مظفر آباد پر حملے کے لیے اصرار کیا۔انھوں نے دوسو مجاہدین کو ان کے ہمراہ روانہ کر دیا۔مظفر آباد پر زبردست خان اور مجاہدین کو فتح ہوئی،مگر زبردست خان نے تیور بدلنے شروع کر دیے۔اسی اثنا میں شیر سنگھ نے مظفر آباد پر حملہ کر دیا۔زبردست خان کی بے ہمتی کی وجہ سے مجاہدین کو فرار کی راہ اختیار کرنا پڑی۔مولوی صاحب کی قیادت میں مجاہدین واپس بالاکوٹ پہنچے۔

مولانا محمد اسماعیل جو بالاکوٹ میں تھے،ان سے کشمیر کے کچھ معتبر افراد نے ملاقات کی۔انھوں نے کہا کہ کشمیر کے مسلمان مجاہدین کے لشکر کی آمد سے بہت خوش ہیں۔کشمیر بالاکوٹ سے صرف تین منزل کے فاصلے پر ہے۔ہم چاہتے ہیں کہ آپ یہاں پر اپنی حکومت قائم کریں اور ہمیں سکھوں کے ظلم سے نجات دلائیں۔مولانا اسماعیل نے یہ پیغام من وعن سید احمد کی طرف بھجوایا۔انھوں نے مقامی لوگوں سے مشورہ کیا تو انھوں نے کہا کہ آپ کے یہاں سے کوچ کر جانے کے بعد سکھ ہمیں تباہ کر دیں گے۔اس لیے بہتر یہ ہے کہ آپ یہاں کے سکھوں سے نمٹ کر ہی آگے جائیں۔اس سے آپ کی دھاک بھی بیٹھ جائے گی اور اگلے معاملات آسان ہوں گے۔سید صاحب نے اس مشورے کو قبول کیا۔

حبیب اللہ خان نے جو بالاکوٹ میں مقیم تھا،سید احمد کو یہ اطلاع دی کہ شیر سنگھ کا لشکر بالاکوٹ سے ڈھائی کوس کے فاصلے پر پہنچ چکا ہے۔یہ اطلاع ملنے کے بعد مجاہدین کے لشکر کے ساتھ وہ بالاکوٹ روانہ ہو گئے۔وہاں پہنچ کر انھوں نے جنگی حکمت عملی کے لیے احباب سے مشورہ کیا۔احباب نے چھاپہ مارنے کا طریقہ تجویز کیا۔مگر سید احمد نے اس مرتبہ براہ راست جنگ کا فیصلہ کیا۔اس موقع پر انھوں نے فرمایا:

> ''اتنے برس ہم نے اس کار خیر کے واسطے طرح طرح کی کوشش و جاں فشانی کی،اپنی دانست میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا، ہندوستان،خراسان اور ترکستان میں اپنے خلفا روانہ کیے،انھوں نے بھی حتی الامکان دعوت فی سبیل اللہ میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور ہم بھی جہاں جہاں گئے،وہاں کے لوگوں کو ہر طریقے پر وعظ و نصیحت سے سمجھاتے رہے،مگر سوائے تم غربا کے کسی نے ہمارا ساتھ نہ دیا،بلکہ ہم پر طرح طرح کا افترا کیا۔اب ہمارے کاتب بھی خطوط لکھتے لکھتے تھک گئے اور ہم بھیجتے بھیجتے تنگ آ گئے اور کچھ ظہور میں نہ آیا۔اب یہی خوب ہے کہ اپنے سب غازی بھائیوں کو پہروں پر سے اپنے پاس بلوا لیں۔کل صبح کو اسی بالاکوٹ کے نیچے ہمارا اور کفار کا میدان ہے۔اگر اللہ نے ہم عاجز بندوں کو ان پر فتح یاب کیا تو پھر چل کر لاہور دیکھیں گے اور جو شہید ہو گئے تو ان شاء اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں چل کر عیش کریں گے۔''(ابوالحسن علی ندوی،سید احمد شہید ۲/۴۲۱)

اس کے بعد سید صاحب نے مورچہ بندی کی اور سکھوں کے حملے کا انتظار کرنے لگے۔ سکھوں نے حملہ کیا، مجاہدین بے جگری سے لڑے۔ سکھوں کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ اس حملے میں مولانا اسماعیل شہید ہو گئے۔ مجاہدین نے تعاقب کیا تو سکھوں نے مڑ کر زوردار حملہ کیا۔ مجاہدین اس کا مقابلہ نہ کر سکے اور پے در پے شہید ہوتے چلے گئے۔ سید احمد بھی شہید ہو گئے۔

نتائج

سید احمد شہید اور ان کے رفقا نے اپنے پروردگار اور اس کے دین سے اپنے تعلق و محبت کا اظہار جس سطح پر کیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اگرچہ ہم عاجز و خاکسار، ذرۂ بے مقدار ہیں، لیکن بلاشک محبت الٰہی سے سرشار اور غیر خدا کی محبت سے بالکل دستبردار ہیں۔'' (ابوالحسن علی ندوی، سید احمد شہید ۱/۳۵۵)

''تاج فریدون و تخت وسکندری کی قیمت میرے نزدیک ایک جو کے برابر بھی نہیں۔ کسریٰ و قیصر کی سلطنت میں خاطر میں بھی نہیں لاتا۔ ہاں، اس قدر آرزو رکھتا ہوں کہ اکثر افرادِ انسانی، بلکہ تمام ممالک عالم میں رب العالمین کے احکام، جن کا نام شرع متین ہے، کسی کی مخالفت کے بغیر جاری ہو جائیں، خواہ میرے ہاتھ سے، خواہ کسی دوسرے کے ہاتھ سے۔ پس ہر ترکیب و تدبیر، جو اس مقصد کے حصول کے لیے مفید ہو گی، عمل میں لاؤں گا۔'' (ابوالحسن علی ندوی، سید احمد شہید ۱/۳۶۰)

ان کی محنت و مشقت کی ایک جھلک بھی ملاحظہ فرمائیے۔ جہاد کے دوران میں ایک مقام پر اکثر مجاہدین بیمار ہو گئے تو اس موقع پر انھوں نے صبر و استقامت کی قابل رشک مثالیں پیش کیں۔ سید ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں:

''مجاہدین کے لیے یہ بڑے ابتلا کا زمانہ تھا۔ گنتی کے چھ سات آدمی تو تندرست تھے، باقی سب بیماروں کی خدمت کرتے تھے۔ کھانے کی تنگی کا یہ حال تھا کہ ایک مٹھی مکئی ہر آدمی کو ملتی تھی۔ تندرست لوگ اس کو چکی میں پیس لاتے اور لپٹا پکا کر مریضوں کو کھلاتے اور خود کھاتے۔ ایک ترش تین پتی کی گھاس ہوتی تھی، جس کو فارسی میں سہ برگہ کہتے ہیں، اس کو پیس چھان کر تھوڑا سا نمک ملا کر ان مریضوں کو پلاتے تھے۔ یہی دوا تھی۔ کسی دن وہ ایک مٹھی مکئی بھی نہ ملتی۔ اس دن گھاس کی پتیاں، جو بے مزہ نہ ہوتیں اور پکانے میں گل جاتیں، جنگل سے توڑ لاتے اور بڑی بڑی ہانڈیوں میں نمک ڈال کر ابال لیتے اور ان مریضوں کو کھلاتے اور خود بھی کھاتے۔ کسی روز ایک بیمار مرتا، کسی روز دو، کسی روز تین، تار بندھا تھا۔ جو مر جاتے، اگر ان کی کوئی چادر ہوتی، تو اسی کو پاک کر کے اس میں لپیٹ کر دفن کرتے۔ کئی جاجمیں بھی دھلی ہوئی رکھی تھیں۔ اگر مرنے والے کے پاس کوئی چادر بھی نہ ہوتی تو انھیں جاجموں میں سے ایک چادر پھاڑ کر اس کے کفن کا انتظام کرتے تھے۔''

(سید احمد شہید ۲/۹)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حقیقت یہ ہے کہ سید احمد اور ان کے احباب کا اصل ہدف احیاے امت اور رضاے الٰہی کا حصول تھا۔ اس مقصد کو پانے کے لیے انھوں نے اپنے ہنستے بستے گھر یہ جانتے بوجھتے چھوڑ دیے کہ ان میں واپسی ناممکن ہے۔ اپنے اہل خانہ کی محبت اور رضا پر اپنے پروردگار کی محبت اور رضا کو فائق سمجھا اور اپنی دانست میں اسی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے عازم سفر ہوئے۔ زندگی کی بے شمار نعمتوں اور آسایشوں کو آن واحد میں ترک کر دیا۔ مختصر سے عرصے میں عزیمت کی ایسی داستانیں رقم کیں کہ کتاب تاریخ کے مضامین ایثار کا خلاصہ قرار پائے۔ اس کے صلے میں اپنے مالک سے اگر کچھ مانگا تو وہ مال و دولت، جاہ و حشمت اور ملک واقتدار نہیں، بلکہ اس کی خوشنودی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ رضاے الٰہی کی جستجو میں اس درجۂ کمال پر فائز ہوئے کہ دور صحابہ کی یاد تازہ ہوگئی۔

ایثار وعزیمت کی ان بلندیوں کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ احیاے امت کے حوالے سے کوئی معمولی تغیر لائے بغیر اپنی جانیں راہ خدا میں لٹا کر رخصت ہو گئے۔ سید احمد اور ان کے رفقا صفحۂ ہستی سے مٹا دیے گئے۔ سکھوں نے آتش انتقام میں مسلمانوں کی بستیوں کو تاراج کیا۔ بالاکوٹ کو گھیر لیا، گھروں کو آگ لگا دی۔ ان مجاہدین کو بھی شہید کر دیا جو بیمار اور ناتواں تھے۔ جہاں تک ہند کے مسلمانوں کا تعلق ہے تو وہ ایک جانب دین کے محافظوں کی ایک بڑی جماعت سے محروم ہو گئے اور دوسری جانب اپنے سے خائف انگریز حکمرانوں کی بے انصافی کا شکار ہو گئے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

خدا کی رحمت ـــــ خدا کا عذاب

اگر اللہ لوگوں کے لیے عذاب کے معاملے میں ویسی ہی سبقت کرنے والا ہوتا جس طرح وہ ان کے ساتھ رحمت میں سبقت کرتا ہے تو ان کی مدت تمام کر دی گئی ہوتی (یعنی ان کا خاتمہ ہو جاتا) تو ہم ان لوگوں کو جو ہماری ملاقات کی توقع نہیں رکھتے ان کی سرکشی میں بھٹکتے رہنے کے لیے ڈھیل دے دیتے ہیں۔(یونس ۱۰:۱۱)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اپنے فضل و رحمت سے نوازنے اور ان پر قہر نازل کرنے کے بارے میں اپنی سنت بیان کی ہے کہ وہ لوگوں پر رحمت کرنے میں جلدی کرتا ہے، مگر عذاب بھیجنے اور سزا دینے کی صورت میں آخری درجے میں ضبط وتحمل سے کام لیتا اور اپنی حکمت کے لحاظ سے ٹالتا رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا اپنی رحمت کے ظہور کے لیے بنائی ہے۔ رحمت کا یہ ظہور ارادے کی آزادی اور اختیار کے صحیح استعمال کے ساتھ وابستہ ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ بندے اسی کی عنایات، فضل واحسان اور مہربانیوں کے قدر دان بن کر جینے کا عہد کریں اور ہر حال میں نیکی کی راہ اختیار کیے رکھیں۔ اس کے عوض میں وہ اپنے بندوں کو دنیا و آخرت، دونوں میں اپنے فضل و کرم کا سزاوار ٹھیراتا ہے۔ اللہ ایسے لوگوں کو دنیا میں پاکیزہ زندگی گزارنے کے حالات کو سازگار بنا دیتا ہے۔ وہ انھیں دنیا کی آزمایش میں صبر واستقامت کے ساتھ حق پر قائم رہنے کا حوصلہ دیتا ہے اور مصائب اور تکالیف کی صورت میں ان کے ایمان کو قوی کرتا ہے۔ اس سے ان کے نفوس کا تزکیہ ہو جاتا ہے۔ وہ مشکلات ومصائب کے باوجود سکون اور اطمینان محسوس کرتے ہیں اور اپنے رب پر ان کا یقین اور مضبوط ہو جاتا ہے۔

اس کے برخلاف بندہ اگر عالم کے پروردگار کے بارے میں بے پروا اور سرکش ہو جائے اور نافرمان ہو کر شیطان کی راہ پر چلنے کا فیصلہ کر لے تو ایسا نہیں ہوتا کہ اس کی فوراً گرفت ہو جاتی ہے بلکہ اسے ڈھیل ملتی ہے۔ اللہ اسے مہلت دیتے ہیں تاکہ وہ اگر چاہے تو اپنی اصلاح کر لے۔ اس طرح کی مہلت ملنے کے باوجود بندہ اگر برائی پر جما رہے اور خدا کی طرف متوجہ نہ ہو اور اس ڈھیل ملنے کا فائدہ نہ اٹھائے تو پھر وہ خدا کے غضب کی زد میں آ جاتا ہے۔ پھر ہو سکتا ہے کہ وہ اسی دنیا میں اس کو پکڑے اور

اسے سزا بھی مل جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خدا اپنی حکمت کے تحت دنیا میں اس کی گرفت نہ کرے اور زندگی کے آخری سانس تک اسے کھل کھیلنے کا موقع ملا رہے۔ یہ صورت مجرموں کی آزمایش کو مزید سخت کر دیتی ہے۔ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ سرکشی کے باوجود خدا اگر ان کا راستہ نہیں روک رہا، بلکہ انھیں زیادہ کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں تو خدا کی مرضی بھی یہی ہے کہ میں ایسی ہی زندگی گزاروں۔ اس سے اس کی شقاوت اور بدبختی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور بالآخر وہ شیطان کے راستے پر چلتے ہوئے زندگی کے آخری کنارے پر پہنچ جاتا ہے جہاں آخرت کی سختیاں اور جہنم کا عذاب اس کے منتظر ہوتے ہیں۔

آیت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ خدا کے بارے میں یہ باغیانہ رویہ آخرت پر یقین نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ کسی حقیقت کو محض ماننا اور دل کے یقین کے ساتھ تسلیم کرنا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ محض ماننے سے یقین پیدا نہیں ہوتا اور یقین پیدا ہو جانے کے بعد ماننا ایک زندہ حقیقت بن جاتا ہے۔

_____ محمد اسلم نجمی

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

پیمانہ

روزمرہ کی زندگی میں ہمیں قسم قسم کے معاملات پیش آتے ہیں۔ گھریلو زندگی اور گھر کے باہر کے معاملات میں ہر طبیعت اور ہر مزاج کے لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اور اس میں کوئی استثنا نہیں ہے، دوسروں کے لیے وجہ شکایت بنتا ہے۔ کسی کو ہم سے تیمارداری نہ کرنے کی شکایت ہوتی ہے۔ کسی کو ضرورت کے وقت تعاون نہ کرنے کی۔ کسی کو کسی موقع پر ہم سے خفت اٹھانی پڑی ہے اور کسی کو ہم نے بدزبانی سے مجروح کیا ہے۔

یہ غلطیوں کی ایک نوعیت ہے۔ اس سے آگے شکایات کی ایک اور دنیا بھی ہے جس کا ہمیں سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ شکایات ہم سے وابستہ توقعات کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں۔ کہیں ہم صحیح بیٹے ثابت نہیں ہو سکے، کہیں صحیح والد۔ کسی استاد کو شکایت ہے کہ ہم اچھے شاگرد نہیں۔ اور ہم میں سے کوئی اگر استاد ہے تو اس کے بعض شاگرد شکایت کرتے ہیں کہ ہم اچھے استاد نہیں اگر کسی کا ماتحتوں سے واسطہ ہے تو بعض ماتحت اس سے شاکی ہیں اور اگر کوئی ماتحت ہے تو اس کا باس اسے اچھا نہیں گردانتا۔ چھوٹے بھائی بڑے بھائی کو اچھا سرپرست قرار نہیں دیتے اور بڑا بھائی چھوٹوں کا رویہ درست ماننے میں متأمل ہے۔ غرض یہ کہ ہمیں جو حیثیت حاصل ہے، اس حیثیت میں ہم سے کچھ توقعات وابستہ ہیں اور جس کے نزدیک ہم توقعات پر پورے نہیں اترے وہ ہم سے شاکی نظر آتا ہے۔

شکایت کی ایک سطح اس سے بھی بلند ہے۔اس کا سامنا ہم اس وقت کرتے ہیں جب لوگ ہمیں بہتر صلاحیت کا حامل یا زیادہ سمجھ دار خیال کرتے ہیں۔ یہ معاملہ ہمیں اس وقت بھی پیش آتا ہے جب ہم نظریاتی یا مذہبی شخصیت کے طور پر سامنے آتے ہیں۔اب ہم لوگوں کی نظر میں ایک بڑے آدمی ہیں۔''بڑا آدمی'' ایک پیمانہ ہے۔ ہمارے ہر ہر عمل کو اس پیمانے پر ناپا جار ہا ہے۔ جہاں جہاں لوگوں کو ہمارے ہاں کوتاہی نظر آتی ہے، وہ ہم پر تنقید کرتے ہیں۔

تنقید کی یہ یورش ہماری زندگی کو تلخ بنا دیتی ہے۔ یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔اب ذرا اس کا دوسرا رخ دیکھیے۔یعنی ہم اس تنقید کو کس طرح دیکھتے ہیں۔ہم تنہائی میں بیٹھیں تو اس تنقید کا کیا جواب ہمارے ذہن میں آتا ہے۔لوگ تنقید کر رہے ہوں تو ہم اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔

بہت کم ایسا ہوتا ہے جب ہمیں کوئی تنقید درست لگتی ہے۔ بالعموم ہم اپنے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی جواز رکھتے اور اسے پیش کر دیتے ہیں۔کبھی ہم اس کا جواز متعلقہ افراد کے رویے سے دیتے اور کبھی درپیش حالات سے اس کی گنجایش نکال لیتے ہیں۔اسی طرح کا ایک جواز ہم اپنے ضعف یعنی بحیثیت انسان اپنی محدودیت سے پیش کرتے ہیں۔کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ ہم اپنی محدودیت کا اعتراف لوگوں کے سامنے کریں۔لوگوں کے سامنے تو ہم تمام ذمہ داری دوسروں ہی پر ڈالتے ہیں۔لیکن تنہائی میں جب سائل اور مسئول ہم خود ہی ہوتے ہیں تو یہ اعتراف ہمارے لیے بڑے اطمینان کا سامان بنتا ہے۔

اس سارے تجزیے اور جواب سے ہمیں سب سے ایک شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ہم محسوس کرتے ہیں کہ لوگوں نے ہمارا عذر قبول نہیں کیا۔ہم خیال کرتے ہیں کہ بعض تقاضے غیر حقیقی ہیں۔اگر لوگوں کا تقاضا حقیقی ہوتا تو انھیں ہم سے کوئی شکایت نہ ہوتی۔غرض یہ کہ تنقید اور شکایات کا جواب دینے کے بعد ہم لوگوں کے رویے اور آرا میں تبدیلی کی توقع کرتے ہیں،لیکن اکثر یہ توقع پوری نہیں ہوتی۔اس سے ہم اور دکھی ہو جاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہم اپنی تنقید اور شکایت کے جواب میں اپنے مخاطب کو یہی رویہ دیتے ہیں؟ کیا ہم اس کے ضعف کا لحاظ کرتے اور اس کے عذر مان لیتے ہیں؟ کیا ہمارے لینے اور دینے کے باٹ الگ الگ نہیں ہیں؟ کیا پیمانہ ایک نہیں ہونا چاہیے؟ دیکھیے، پیغمبر کا فرمان ہے:

''(ایمان یہ ہے کہ) تو لوگوں کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اور جو اپنے لیے ناپسند کرے وہی لوگوں کے لیے ناپسند کرے۔''(مسند احمد، عن معاذ بن جبل)

ــــــ طالب محسن

اياك نستعين: ایک اہم پیغام

سورۂ فاتحہ جن مضامین کی حامل ہے، وہ یقیناً نہایت گہرے اور وسیع سمندر کے مانند ہیں: تصورِ رب، ہدایت، اس کی بنیاد ،اس کی طلب، اس کا شعور اور اس کی تاریخ کو جس خوبی سے اس سورہ میں تلمیح، کنایے اور بیان کے اسالیب میں سمیٹا گیا ہے، اس کی نظیر شاید ہی کسی کلام میں ملتی ہو۔ ہم ان سب مضامین سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ـــــ اس لیے کہ ان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ـــــ قارئین کو ایک ایسی بات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں، جسے وہ ہر روز پڑھتے ہیں، مگر اس کے اہم پیغام سے غیر ارادی طور پر بے اعتنائی سے گزر جاتے ہیں۔

سورۂ فاتحہ کا یہ پیغام اس کی آیت 'اياك نعبد و اياك نستعين' کے بین السطور ہے۔ 'نستعين' میں جس استعانت اور مدد کی بات کی گئی ہے، وہ عام انسانی سطح پر مانگی گئی مدد نہیں ہے، بلکہ یہ وہ مدد ہے جو کسی مافوق الفطرت قوتوں کی مالک ذات سے مانگی گئی ہو۔ مثلاً ایک مدد دریا میں ڈوبنے والا ساحل پر چلتے راہ گیروں کو پکار کر مانگتا ہے جو وہاں موجود ہونے کی وجہ سے اس کی پکار سن سکتے ہیں اور پانی میں اتر کر اس کی جان بچا سکتے ہیں۔

ایک مدد وہ ہے جو مثلاً ڈوبنے والا کسی ایسے شخص کو پکار کر مانگتا ہے جو نہ وہاں موجود ہوتا ہے اور نہ وہ راہ گیر کی طرح پانی میں اتر کر اس کی مدد کرتا ہے، بلکہ پکارنے والے کو یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ یہاں موجود نہ ہونے کے باوجود اس کی پکار سنتا ہے، اور پانی میں اترے بغیر اپنی جگہ پر بیٹھا بیٹھا اپنی غیر مرئی قوتوں سے اسے بچا سکتا ہے۔ یہی استعانت یہاں 'نستعين' میں مراد ہے۔ اگر اس استعانت کی حقیقت پر غور کیا جائے تو یہ 'نعبد' سے الگ نہیں ہے، بلکہ اسی کا ایک بڑا حصہ ہے۔ استعانت دعا ہے اور دعا عبادت کا بھی مغز ہے۔ چنانچہ اگر استعانت عبادت ہی کا ایک بڑا حصہ ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے الگ سے بیان کیوں کیا گیا ہے اور اتنی اہم سورہ میں اسے ہی کیوں بیان کیا گیا ہے۔

اس کو الگ سے بیان کرنے کا ایک پہلو یہ ہے کہ اسلام کے بعد بالخصوص اور اسلام سے پہلے بالعموم، یہ بات تاریخ مذاہب میں دیکھی جا سکتی ہے کہ شرک کا آغاز ہمیشہ استعانت ہی سے ہوتا ہے: لوگ کچھ بزرگوں یا خیالی شخصیات کو خدا کا مقرب سمجھتے اور اپنے گناہوں کی معافی اور اپنے دنیوی مسائل کے حل کے لیے ان کی وساطت سے مدد طلب کرتے ہیں۔

ٹھیک اسی طرح امت مسلمہ میں بھی بعض علاقوں اور مکاتب فکر میں شرک شروع ہو رہا ہے۔ یہ شرک استعانت ہی کی نوعیت کا ہے۔ لوگ ماضی و حال کی بعض شخصیات کو ''وسیلہ'' قرار دیتے اور ان سے اولاد، مال و دولت کی محرومی کی صورت میں

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

طالب مدد ہوتے ہیں۔

ہم سورۂ فاتحہ کی اس آیت کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی اس راہ نمائی کو پورے وثوق سے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ استعانت بھی شرک ہے۔ جس طرح کسی کے آگے سجدہ کرنا ممنوع ہے، اسی طرح اس نوعیت کی مدد طلب کرنا بھی شرک و گناہ ہے۔ 'ایاك نعبد' کے بعد 'ایاك نستعین' کا اضافہ امت کی تعلیم کے لیے تھا۔ چونکہ پرستش اور استعانت دونوں میں شرک ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہماری یاددہانی کے لیے 'ایاك نستعین' کو سورۂ فاتحہ کا حصہ بنا دیا ہے تاکہ پانچ وقت کی نماز امت کو اس بات کی یاددہانی کرائے کہ پرستش کی طرح خدا کے سوا کسی سے طلب مدد یا استعانت بھی بچنے کی چیز ہے۔

خدا ہمیں 'ایاك نعبد' کے ساتھ ساتھ 'ایاك نستعین' کا سبق یاد رکھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

ــــــ ساجد حمید

جائزہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ایک قید خانہ تھا، جس میں بڑے بڑے ڈاکو اور قاتل بند تھے۔ ہفتہ میں ایک دن کسی واعظ کو بلایا جاتا جو انھیں نصیحت کیا کرتا تھا۔ ایک بار کسی نوجوان واعظ کو دعوت دی گئی۔ وہ جب ہال میں داخل ہوا تو درشت چہروں اور بے رحم نظروں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ گھبرا گیا۔ کسی شے میں اس کا پاؤں الجھا اور وہ گر گیا جس پر قیدی ہنسنے لگے۔ نوجوان واعظ تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہوا اور بولا: میں آپ کو یہی بتانے آیا تھا کہ آدمی گر جائے تو اٹھ بھی سکتا ہے۔ گر جانا کوئی ایسی بات نہیں، انسان خطا کا پتلا ہے، ہر شخص سے بھول چوک ہو سکتی ہے، مگر گرے رہنا بری بات ہے۔ دوسرے الفاظ میں گناہ سرزد ہو جانا کوئی ایسی بات نہیں۔ توبہ کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں، اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کے گناہ معاف کرنا بہت پسند ہے، مگر سوچ سمجھ کر گناہ کرنا اور پھر اس پر جمے رہنا بری بات ہے۔

اس واقعہ سے ہمیں یہ سبق ملا کہ ہر شخص کو چاہیے کہ وہ روزانہ اپنا جائزہ لے اور جو گناہ اس سے سرزد ہوئے ان سے بچنے پر غور کرے اور ان گناہوں سے جنھوں نے زندگی کو آلودہ کیا، ان کی بخشش کے لیے اللہ کی طرف رجوع کرے اور اللہ کے حضور میں جواب دہی کا احساس تازہ کرے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دنیا کی آلایشوں اور بندھنوں میں پھنس کر اس حیاتِ دنیوی کی قیمتی مہلت کو کھو دے اور اللہ کی ابدی ناراضی، دوسرے لفظوں میں ابدی سزا میں مبتلا ہو جائے۔

ــــــ محمد وسیم اختر مفتی

○

یہی زہراب ہے ، یہی تریاق　　آرزو ، جستجو ، وصال و فراق

پڑھ رہے تھے فسانہ ہاے وجود　　پھر کسی نے الٹ دیے اوراق

دل اگر ہو خدا سے بے گانہ　　صبر ہوتا ہے آدمی پر شاق

درسِ حکمت ہے زندگی کے لیے　　اے مہِ نو ، ترا عروج و محاق

غم سے ایوان کلبۂ احزاں　　سرخوشی ہو تو جھونپڑے بھی رواق

برق آسا تھی ہر نوا ، لیکن　　تیرا جوہر نہ کر سکی براق

سوے بطحا یہ رہرووں کا ہجوم
دل اسی رہ گزر کا تھا مشتاق

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org